

پروفیسر مشیرالحق (شہید)

بلوحِ تربت من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

عربی زبان میں کسی کا قول ہے کہ ''بڑوں کی موت نے مجھے بڑا بنا دیا۔''
۱۰/اپریل ۱۹۹۰ء (مطابق ۱۴۱۰ ہجری) کا یہ واقعہ ہے۔ تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں اپنی کبرسنی کے باوجود میں بہت چھوٹا تھا کیوں کہ بھائی جان (پروفیسر مشیر الحق شہید) زندہ تھے اور اس چھوٹے ہونے کی کیفیت میرے لیے اتنی طمانیت آمیز اور مسرت آفریں تھی جس کا لطف تو لیا جاسکتا ہے، اظہار نہیں کیا جاسکتا۔ ہم دونوں کے درمیان ہزار میل کا مکانی اور چالیس سال سے اوپر کا زمانی فاصلہ بھی اس کیفیت پر کبھی اثر انداز نہ ہوسکا لیکن جوں ہی ان کی شہادت کا سانحہ گزرا تو میں یکایک اتنا بوڑھا ہوگیا کہ... کہ زندگی تو اپنے وقت معینہ تک گزرتی ہی رہے گی لیکن ''کیا لطف زندگی کا جب دل ہی بجھ گیا ہو۔''

میں نے اپنی مستقل ملازمت کی ابتدا ۱۹۵۱ء میں پاکستان سیکریٹریٹ میں ایک لوئر ڈویژن کلرک کی حیثیت سے کی اور بہت جلد ترقی کے مختلف مرحلوں سے گزرتا ۱۹۵۹ء میں سیکشن افسر ہوگیا۔ پھر ڈپٹی سیکریٹری اور جوائنٹ سیکریٹری ہوکر جون ۱۹۹۲ء میں ریٹائر ہوا۔ اسے بھی اب گیارہ سال ہوگئے۔ ۱۹۹۰ء سے بھی پہلے جب کہ آفتابِ عمر لبِ بام آنے لگا، میں نے سوچا کہ دنیا نے مجھے تجربات کی شکل میں جو کچھ دیا ہے، میں تحریری شکل میں اسے لوٹا دوں۔ لہٰذا میں نے اپنی خودنوشت لکھنے کا ارادہ کیا اور کوئی

دو سو صفحے لکھ ڈالے۔ اس امر میں جن لوگوں نے میری بڑی ہمت افزائی کی اور میری کاوش میں گہری دلچسپی لی، ان میں بھائی جان سرِفہرست تھے۔ ۱۹۸۹ء میں وہ چند دنوں کے لیے پاکستان آئے تو دن بھر کی مصروفیات سے فارغ ہوکر انھوں نے میرے نامکمل مسودے کو لفظ بہ لفظ پڑھا اور اس کی عکسی نقل اپنے ساتھ لے گئے اور پھر ہندوستان واپس جاکر خط کے ذریعے پوری تفصیل کے ساتھ مجھے مشورے دیے اور صفحوں اور سطور کے حوالوں سے جہاں کہیں غلطیاں تھیں، ان کی نشان دہی کی۔

میرا ارادہ تھا کہ میں اپنی خود نوشت کے تھوڑے تھوڑے صفحات بھائی جان کو بھیج کر ان کی رائے لیتا رہوں گا لیکن خود ان کے بارے میں جو کچھ لکھوں گا، وہ انھیں اس وقت دیکھنے کو ملے گا جب کتاب چھپ کر سامنے آجائے گی۔

تقسیمِ ہند کے بعد سے تقریباً چالیس پینتالیس سال ہم دونوں بھائیوں کے اس طرح گزرے کہ میں پاکستان میں "مدخولۂ حکومت" بنا ہوا، دفتری نوکری کرتا رہا جب کہ بھائی جان ہندوستان میں دہلی اور علی گڑھ اور کناڈا میں میک گل سے ڈگریوں پر ڈگریاں لیتے رہے اور مختلف علمی اداروں میں ان کا اجرا کراتے رہے۔ انھوں نے اپنی مستقل تدریسی زندگی بھی یونی ورسٹی کے لکچرر کے طور پر شروع کی اور وائس چانسلر کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے کہ وقتِ شہادت آپہنچا۔ تدریس کے علاوہ تحریر بھی ان کی زندگی کا ایک مستقل حصہ تھی اور انھوں نے اردو، انگریزی اور ہندی میں درجنوں کی تعداد میں کتابیں اور سیکڑوں کی تعداد میں مضامین لکھے۔

آج سے کوئی تیس سال پہلے انھوں نے اپنی کتاب "مذہب اور جدید ذہن" (مطبوعہ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۷۴ء) میرے نام معنون کی تھی۔ فارسی کی ایک رباعی پر مشتمل ان کی وہ انتسابی تحریر میرے لیے ایک ایسی انبساطی تحریر تھی جس کا لطف میں آج تک لیتا ہوں۔ میری تمنا تھی کہ میری خود نوشت جب چھپے گی تو میں اسے ان کے نام منسوب کروں گا۔ چناں چہ اپنے ذہن میں بھائی جان سے متعلق میں نے خدا جانے کیا کیا ڈائیلاگ سوچے ہوئے تھے اور کیسے کیسے شاہ کار جملے وضع کر رکھے تھے لیکن اب

جب کہ وہ میری مطبوعہ یا غیرمطبوعہ ہر قسم کی تحریروں سے بے نیاز ہو چکے ہیں اور میری خودنوشت کے چھپنے کے آثار بھی دور دور تک نظر نہیں آتے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔ وہ تمام جملے لوحِ دماغ سے اس طرح مٹ گئے ہیں گویا کبھی ذہن میں آئے ہی نہ تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب کیوں لکھوں اور کس کے لیے لکھوں۔ گویا دل کی باتیں تو دل ہی میں رہ گئیں۔ بہرحال اب یہ مضمون میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ بھائی جان کی زندگی کا ابتدائی حصہ بالکل تاریکی میں نہ رہ جائے۔ ان کی پختہ عمری کے دور کے حالات، ان کی شہادت کے بعد ان کے ہم کاروں اور ہم درسوں نے لکھے ہیں، جسے ان کے داماد اور بھانجے شاہ عبدالسلام نے ''ڈاکٹر مشیر الحق، شخصیت اور فکری بصیرت'' کے نام سے کتابی شکل میں ۱۹۹۴ء میں ہندوستان سے شائع کیا۔

ان لکھنے والوں میں مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، مولانا مجیب اللہ ندوی، مولوی ضیاء الدین اصلاحی، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی اور پروفیسر نثار احمد فاروقی سمیت چالیس سے اوپر پروفیسر اور جید علما شامل ہیں جن میں سے بعض ان کے استاد بھی تھے۔

میرا جی چاہتا ہے کہ کچھ اور لکھنے سے پہلے میں آپ کو بھائی جان کی اس انتسابی تحریر کے لطف میں شریک کروں جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے:

''محی کے نام

دوست نزدیک تر از من بمن است
ویںست مشکل کہ من از وے دورم
چہ کنم با کہ تو آں گفت کہ او
درکنارِ من و من مہجورم

(میں خود سے جتنا قریب ہوں، میرا دوست اس سے زیادہ مجھ سے قریب ہے بس مشکل یہ ہے کہ میں (خود) اس سے دور

ہوں۔ کیا کروں؟ یہ بات کس سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ میری
بغل میں موجود ہے اور میں اس کے فراق میں تڑپ رہا ہوں)''

اب جب کہ بھائی جان نہیں رہے، میں ان کے تاثرات کا کیا جواب دوں۔ لہٰذا انھیں مخاطب کیے بغیر خود اپنے دل کی بھڑاس مٹانے کے لیے میں سیّدنا شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی کا ایک مقطع پڑھنے پر اکتفا کرتا ہوں:

''محی بر شمعِ تجلائے جمالش می سوخت
دوست می گفت زہے ہمتِ مردانۂ ما

محی (یعنی میں) اپنے محبوب کے حسن کی جھلک دیکھ کر جان دیے
دے رہا تھا اور وہ مجھے میری اس جاں سپاری پر شاباش دے رہا
تھا کہ اسے ایک نظر دیکھ لینا مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا)''

ہمارے والد یو پی پولیس میں سب انسپکٹر تھے۔ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ وہ مشرقی یو پی کے ایک دور افتادہ دیہاتی تھانے میں بہ حیثیت انچارج تھانہ تعینات تھے۔ رات کو سینے میں درد اٹھا جس کے پیچھے کچھ عجیب وغریب واقعات بھی سننے میں آئے اور پھر وہ آناً فاناً اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ان دنوں ہماری والدہ اپنے بچوں سمیت آبائی گاؤں (بحری آباد، ضلع غازی پور) آئی ہوئی تھیں۔ دونوں جگہوں کا درمیانی فاصلہ کوئی سو میل کا ہوگا اور وہ بھی ایک ہی ملک بلکہ ایک ہی صوبے میں جہاں کسی قسم کی سفری پابندیاں بھی نہ تھیں لیکن ہوا کیا؟ تھانے سے ایک چوکی دار خبر لے کر گاؤں آیا۔ یہاں سے لوگ بھاگم بھاگ گئے تاہم خبر رسانی اور ذرائع مواصلات کا یہ عالم تھا کہ کچھ پیدل اور کچھ ٹرین (چھوٹی لائن) سے خبر آتے آتے اور لوگوں کے وہاں پہنچتے پہنچتے دو دن گزر چکے تھے، اور تھانے کا مسلمان عملہ اور مقامی مسلمان (ابا کی) تجہیز وتکفین سے فارغ ہوکر سوئم کی تیاری کر رہے تھے۔ اس کا مقابلہ آپ آج کی سہولتوں سے کیجیے۔ گیارہ اپریل (۱۹۹۰ء) کو صبح چھ بجے دہلی سے کراچی ٹیلی فون پر بھائی جان کی شہادت کی خبر آئی۔ میں کراچی میں تھا۔ خود میرے لیے تو ملازمت کے قواعد وضوابط کے پیشِ نظر

اسلام آباد سے اجازت لینا اور اتنی جلدی دہلی پہنچنا ممکن نہ تھا لیکن میرے برادرِ نسبتی، محمد احمد صدیقی کے علاوہ جو ندوۃ العلما میں بھائی جان کے جونیئر ساتھی تھے، میرے بڑے لڑکے تسنیم الحق فاروقی، تنویر الحق اور ایک بھانجے نے پاکستانی پاسپورٹ کی کارروائی مکمل کی۔ ہندوستانی ویزا حاصل کیا اور ہزار میل کا فاصلہ طے کرکے وہ شام کو تقریباً اسی وقت دہلی پہنچ گئے، جب سری نگر سے بھائی جان کی لاش دہلی آئی اور اس طرح تمام مقامی لوگوں اور قرب و جوار کے شہروں سے آئے ہوئے اعزا کی طرح وہ لوگ بھی جنازے میں شریک ہوگئے۔

جب ابا کا انتقال ہوا تو میری عمر ایک سال سے کچھ کم، بھائی جان کی تین سال سے کم، میری ایک بہن ان سے تقریباً دو سال بڑی اور سب سے بڑی بہن کوئی نو یا دس سال کی تھیں۔ بھائی جان سے بڑی بہن چند برسوں بعد طاعون میں انتقال کرگئیں اور اس طرح ایک بہن اور دو بھائی رہ گئے تھے اور جب بھائی جان نے بھی داغِ جدائی دیا تو بس میں اور میری سب سے بڑی بہن (والدہ ڈاکٹر شاہ عبدالسلام، لکھنؤ یونی ورسٹی) رہ گئے۔ چند سال پہلے میری ان بڑی بہن کا بھی انتقال ہوگیا اور بڑا چھوٹا جو بھی ہوں، میں ہی رہ گیا۔

میرے والد کی پہلی شادی ان کی اپنی چچازاد بہن سے ہوئی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد والد کی دوسری شادی میری والدہ سے ہوئی۔ بھائی جان کی پیدائش سے پہلے ہمارے والد کے یہاں دونوں بیویوں سے چار لڑکیاں پیدا ہوچکی تھیں جن میں سے دو کا انتقال بھی ہوچکا تھا۔ اولادِ نرینہ کوئی نہ تھی جس کی خواہش گھر کے تمام لوگوں کو رہی ہوگی۔ بہرحال ابا کی پانچویں اولاد بھائی جان پیدا ہوئے تو دل کھول کر خوشی کا اظہار کیا گیا اور اس سلسلے میں گاؤں میں جو تقریب منعقد ہوئی اسے ''جشن'' کا نام دیا گیا۔ ہمارا خاندان ''پیرزادہ گھرانا'' کہلاتا تھا جس میں ہر قسم کا گانا بجانا حتیٰ کہ گھریلو تقریبات میں ڈھولک وغیرہ کا استعمال بھی ''بدعت'' اور گناہِ کبیرہ کے زمرے میں آتا تھا۔ لہٰذا بھائی جان کی پیدائش کا جشن دعوتِ عام اور خیر خیرات پر مشتمل تھا۔

بھائی جان کی پیدائش کے اس جشن میں بڑی دھوم دھام رہی اور لوگ خوب ہنستے بولتے رہے۔ کیسی دردناک حقیقت ہے یہ بھی کہ جس شخص کی پیدائش کا یہ منظر تھا، اس کی موت کا بھی یہ سماں تھا کہ بقول ہندوستانی اخباروں کے ''پروفیسر مشیرالحق کے جنازے میں جتنا بڑا ہجوم تھا، اتنا بڑا ہجوم اس سے پہلے صرف ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے جنازے میں دیکھا گیا تھا۔'' اور یہ کہ ''مجمع پروفیسر مشیرالحق کی الم ناک موت، پر زار و قطار رو رہا تھا۔''

یہ خبر پڑھ کر مجھے یاد آیا کہ جب ۱۹۸۷ء میں بھائی جان وائس چانسلر ہوکر سری نگر گئے اور انھوں نے مجھے اس تقرر کی اطلاع دی تو ایک ادارے کی سربراہی کے دشوار گزار مرحلوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انھوں نے مجھے لکھا کہ ''دعا کروں کہ میں اپنے فرض سے اس طرح عہدہ برآ ہوسکوں کہ مجھ پر (شیخ سعدی کی) وہ مشہور رباعی صادق آئے۔

یاد داری کہ وقتِ زادنِ تو
ہمہ خنداں بوند و تو گریاں
پس چناں زی کہ وقتِ مُردنِ تو
ہمہ گریاں بوند و تو خنداں

(کیا تمھیں یاد ہے کہ جب کہ تم پیدا ہوئے تھے تو سب لوگ خوش تھے اور تم رو رہے تھے۔ پس زندگی اس طرح گزارو کہ جب تم مرو تو لوگ رو رہے ہوں اور تم خوش ہو''۔)

میں سمجھتا ہوں کہ ان سے یہ فرمائش کسی غیبی طاقت نے کروائی تھی کیوں کہ ان کی یہ خواہش حرف بہ حرف اس طرح پوری ہوئی کہ جب وہ پیدا ہوئے تھے تو فطری طور پر ہر نوزائیدہ بچے کی طرح وہ خود تو رو رہے تھے لیکن لوگ ان کے ''جشنِ پیدائش'' میں واقعی ہنس رہے تھے اور جب وہ مرے تو شہادت کی موت پاکر وہ تو ہنس رہے ہوں گے لیکن ہزاروں افراد عملاً رو رہے تھے۔

چار ساڑھے سال کی عمر میں بھائی جان بجری آباد کے پرائمری اسکول میں داخل ہوئے۔ یہ اسکول ڈسٹرکٹ بورڈ کے زیرِ انتظام چلتا تھا اور اس میں تعلیم درجہ الف درجہ ب اور پھر درجہ ایک سے درجہ چار یعنی کل چھ سال کی ہوتی تھی۔ بھائی جان تو اسکول میں بھی داخل ہوگئے اور میری اپنی حالت یہ تھی کہ اچھی خاصی عمر تک 'غوں غاں' کرنا بھی نہ آیا تھا۔ گھر والوں کو یقین ہوچلا تھا کہ میں (اگرچہ بہرا نہیں) گونگا ہی رہوں گا۔ مجھے اپنی وہ کیفیت اب تک یاد ہے کہ میں لوگوں کی باتیں سنتا اور خوب سمجھتا تھا اور ضرورت کے مطابق ان پر عمل بھی کرتا تھا لیکن خود کوئی لفظ بولنے سے قاصر تھا۔ اسی دوران میں بھائی جان نے درجہ ب پاس کرلیا۔ ممکن ہے انھیں میرے چہرے پر احساسِ محرومی نظر آیا ہو یا خود ان کی اپنی خواہش یہ ہو کہ میں بھی تعلیم حاصل کروں۔ بہرحال اپنی درجہ ب والی کتاب لے کر وہ ایک کونے میں بچھے ہوئے ایک تخت پر بیٹھ گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ بیٹھا تماشا دیکھتا رہا۔ چوں کہ یہ کوئی غیرمعمولی بات نہ تھی، لہٰذا میری والدہ یا گھر والوں میں سے کسی اور نے اس طرف توجہ بھی نہ دی۔ بھائی جان نے اماں کی قینچی لے کر اپنی کتاب کی ساری تصویریں کاٹ لیں، جن میں گدھے کی تصویر مجھے اب تک یاد ہے۔ ان تمام تصویروں کو انھوں نے الگ الگ ایک کاغذ پر لئی سے چپکا دیا پھر ان تمام کاغذوں کو سی کر انھیں ایک کتابی شکل دے دی۔ دوسرے دن صبح ہوئی تو خاموشی سے اپنے ساتھ مجھے بھی اسکول لے گئے۔ اس زمانے میں وہ اسکول ہمارے گھر سے کوئی دو تین سو گز کے فاصلے پر گاؤں ہی میں واقع تھا۔ میرے دورانِ تعلیم ہی میں اسکول گاؤں سے باہر منتقل ہوا تھا۔

میں پورے دن سعادت مندی سے بھائی جان کے ساتھ بیٹھا اپنی ''مصور کتاب'' کا بڑے غور و خوض اور انہماک سے مطالعہ کرتا رہا۔ دو تین دن گزرے تو اسکول کے ہیڈ ماسٹر (آنجہانی پنڈت بندھیا چل) نے بھائی جان سے پوچھ کر میرا نام درجہ الف کے رجسٹر میں لکھ لیا اور بھائی جان سے کہا کہ اگلے دن وہ میری فیس لیتے آئیں جو غالباً تین پیسے ماہانہ تھی۔ بھائی جان نے اماں سے میری فیس مانگی تب انھیں

معلوم ہوا کہ میں صبح سے شام تک باہر کھیل کود میں مشغول نہیں رہتا تھا بلکہ گونگا عالم بننے کے لیے میں اسکول جایا کرتا تھا اور یہ کہ کئی دن کا تعلیمی مرحلہ میں گزار بھی چکا ہوں۔ میرے چچا (حافظ شاہ بشیر الحق مرحوم) کو جو ابا کے انتقال کے بعد ہمارے سرپرست اور سربراہِ خاندان تھے، یہ لطیفہ معلوم ہوا تو وہ خود اسکول گئے اور پنڈت جی سے کہنے لگے کہ ''ہم لوگوں نے گھر میں تو انھیں کبھی بولتے نہ سنا، اب ذرا تم ہی مجھے ان سے کچھ سنوا دو تاکہ مجھے بھی معلوم ہوجائے کہ یہ اسکول میں کیا پڑھ رہے ہیں۔'' پنڈت جی نے میرے چچا سے کہا، ''حافظ جی! آپ جانتے ہیں کہ اسکول میں جتنے زیادہ بچے داخل ہوتے ہیں، اتنی ہی زیادہ ہماری کارکردگی ظاہر ہوتی ہے۔ اب اگر آپ جیسے زمیں داروں کے بچے بھی اسکول میں داخل نہ ہوئے تو دوسروں پر اس کا کیا اثر پڑے گا اور پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اتنے بچوں کے بیچ میں یہ بچہ دن بھر بیٹھے گا تو شاید دیکھا دیکھی بولنے بھی لگے۔'' چچا کو یہ بات پسند آئی اور وہ فیس دے کر ہنستے ہوئے گھر واپس آگئے۔

اب میں نہیں جانتا کہ یہ مجھ سے صرف دو برس بڑے بھائی کا ''فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی'' یا نیک نیتی پر مبنی پنڈت جی کی خواہش، بہرحال ہوا یہ کہ مشکل سے دو ہفتے گزرے ہوں گے کہ بولتے ہوئے کبوتروں کی ڈار میں بیٹھ کر ایک گونگا کبوتر بھی غٹرغوں کرنے لگا اور 'ت' اور 'ک' کی جگہ 'ٹ'، 'ذ' کی جگہ 'ڈ' اور 'ر' کی جگہ 'ل' کے تلفظ کی ادائیگی کے ساتھ میں بلاجھجک بولنے لگا۔ میرا زیادہ وقت بھائی جان کے ساتھ گزرتا۔ وہ یہ تمام الفاظ صحیح مخرج سے ادا کرتے اور انھیں سنتے سنتے میں نے بھی دو چار برس میں اپنی اس کم زوری پر پوری طرح قابو پا لیا۔

بھائی جان کی طبیعت میں شروع ہی سے بُردباری، سنجیدگی اور متانت کے آثار نمایاں تھے اور ان کے برعکس میں انتہائی غیرذمہ دار، کسی حد تک لاأبالی اور خاصا کھلنڈرا تھا۔ ان کا ہر کام ٹائم ٹیبل، ڈائری اور بجٹ کے عین مطابق ہوتا۔ مجھے ان 'لغویتوں' سے کبھی دلچسپی نہ رہی۔ ہم دونوں بھائی ساتھ رہتے، ساتھ اٹھتے بیٹھتے، ساتھ کھاتے پیتے

اور ساتھ کھیلتے کودتے۔ کسی مرحلے پر جب کوئی چیز لینے دینے یا کھانے پینے کی کوئی چیز بٹنے کا سوال پیدا ہوتا تو میری خواہش ہوتی کہ چھوٹا ہونے کے ناتے میرے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جائے اور ان کی کوشش ہوتی کہ بڑے ہونے کی وجہ سے وہ ایثار سے کام لیں۔ دو سال کی چھوٹائی بڑائی کے اکثر بھائیوں میں میں نے دیکھا ہے کہ ان میں مار پیٹ، لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا ہے لیکن مجھے ایسا کوئی سانحہ یاد نہیں۔ وہ میری غلطیوں کو دیکھتے تھے لیکن کبھی براہِ راست انھوں نے میری کسی غلطی کی نشان دہی نہ کی۔ میں خود ہی ان کی دیکھا دیکھی جتنا کچھ سیکھ لیتا، اتنی ہی میری اصلاح ہوجاتی۔

ایک بار ہم دونوں بھائی گھر کے باہر بیرونی صحن میں کھیل رہے تھے۔ میرے خیال کے مطابق انھوں نے میرے ساتھ کچھ زیادتی کی۔ میں پھن پھناتا ہوا گھر میں آیا۔ برآمدے میں بنے ہوئے چولھے پر کھانا پک رہا تھا۔ میں نے تانبے کا ایک کٹورا لے کر چولھے کے ایک خالی ایلے پر رکھ دیا۔ قریب ہی میری والدہ اور پھوپھی وغیرہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ انھوں نے مجھ سے اس حرکت کا سبب دریافت کیا تو میں نے انھیں بھائی جان کی جانب سے ہونے والی زیادتی کی تفصیل سناتے ہوئے کہا کہ ''یہ کٹورا تھوڑی دیر بعد گرم ہوجائے گا۔ بھائی جان کھیل کر واپس آئیں گے، انھیں پیاس لگی ہوگی، وہ عجلت میں اس کٹورے کو اٹھائیں گے، ان کا ہاتھ جل جائے گا اور اس طرح انھیں زیادتی کی سزا مل جائے گی۔'' اماں نے کہا کہ ''یہ کیا ضروری ہے کہ وہ اسی کٹورے کو اٹھائیں، ممکن ہے وہ دوسرا کٹورا لے کر اس میں پانی پی لیں۔'' بہرحال مجھے مگس کو باغ میں بھیج کر پروانے کو قتل کرنے کی اپنی حکمتِ عملی پر اتنا یقین تھا کہ میں نے ان لوگوں کی کوئی بات نہ مانی۔ اپنی دانست میں کٹورے کو خوب گرم کرکے میں نے کسی صافی یا دست پناہ کے ذریعے اسے اتار کر چولھے سے الگ رکھ دیا اور خود باہر چلا گیا تاکہ بھائی جان کو گھیر کر گھر میں لایا جائے اور ایسا ماحول پیدا کردیا جائے کہ وہ کٹورا اٹھالیں۔ اتفاق تھا کہ اس اثنا میں بھائی جان کہیں اور چلے گئے تھے اور میں بے نیلِ مرام گھر میں واپس آیا۔ اس آپا دھاپی اور بھاگ دوڑ میں، میں اتنا تھک چکا تھا

کہ پیاس معلوم ہونے لگی اور بالکل بے خیالی میں، میں نے خود ہی وہی پیالہ اٹھالیا او
پھر تڑپ کر پیالہ ایک طرف پھینکا اور کرب آمیز لہجے میں چیخنے لگا ''نجیتہ ملا، نجیتہ ملا''
اس ''نجیتے'' کے نتیجے میں گھر میں موجود لوگوں کے تمسخر کا مجھے جس طرح نشانہ بننا پڑا و
آج بھی مجھے یاد ہے۔ میری پھوپھی نے جو مجھے اکثر چھیڑتی رہتی تھیں، منہ پھیر کر
خودکلامی کے انداز میں کہا کہ ''جو دوسروں کے لیے کنواں کھودتا ہے، وہ خود اس میں گرت
ہے۔'' بڑے ہوکر یہی محاورہ جب میں نے فارسی میں پڑھا تو مجھے اس کی صداقت کو
تسلیم کرنے میں کوئی تامّل نہ ہوا کیوں کہ مجھے اپنی 'چاہ کندنی' کا ''نجیتہ'' عملاً مل چکا تھا
جو میری زندگی بھر کے لیے کافی تھا۔ بھائی جان جب گھر واپس آئے اور انھیں یہ لطیفہ
معلوم ہواتو وہ ایک پیار بھری مسکراہٹ سے مجھے دیکھ کر خاموش ہوگئے اور مجھے پھر اِدھر
اُدھر کی باتوں میں لگالیا۔اس وقت میری عمر پانچ چھ سال اوران کی دو سال زیادہ ہوگی۔

بھائی جان مجھ سے دو سال پہلے بحری آباد کے پرائمری اسکول سے فارغ ہوگئے اور انھیں مزید تعلیم کے لیے کہیں باہر جانا تھا۔ ایک بار جب میں شاید دو تین ماہ کا اور بھائی جان بھی کوئی سوا دو سال کے تھے،ابا نے چلتی ہوئی بات کے طور پر اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ بھائی جان کو عربی اور مجھے انگریزی تعلیم دلائیں گے۔ غالبًا اس کا سبب یہ بھی ہوگا کہ خود ابا نے مدرسۂ الٰہیہ، کان پور سے تقریباً آخری درجے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن اپنے بڑے بھائی کے اچانک انتقال کی وجہ سے جو ایک مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، ابا نے گھریلو حالات کے تحت اپنی تعلیم منقطع کرکے ملازمت اختیار کرلی۔ بہرحال بھائی جان کی تعلیم شروع ہوتے وقت ابا کا تو انتقال ہوچکا تھا لیکن ہماری والدہ نے ان کی اس خواہش کو مرحوم شوہر کی وصیت کا درجہ دے دیا تھا اور اس وصیت کی تکمیل کے لیے بھائی جان کو مدرسہ مظاہر العلوم، کچی باغ، بنارس بھیج دیا گیا۔ وہاں سے وہ ہر ہفتے ایک خط اماں کو بھیجتے تھے۔ اسی رفتار سے اماں کے جوابی خط جاتے تھے۔کبھی کبھار مجھ پر بھی دورہ پڑتا تھا اور اپنی شاہ کار اردو میں خط لکھ کر میں اصرار کرتا تھا کہ وہ بھائی جان کو بھیج دیا جائے۔ خط کے خاتمے پر اپنی قابلیت کا اظہار کرنے کے

لیے میں لکھتا تھا ''آپ کا برادر، محی الحق۔'' ایک روز میں نے بھائی جان کا وہ خط پڑھا جو انھوں نے اماں کو لکھا تھا۔ خاتمے پر تحریر تھا ''آپ کا فرزند، مشیر الحق۔'' مجھے ''فرزند'' کا لفظ اس قدر پسند آیا کہ میں اسے استعمال کرنے کے لیے بے تاب ہوگیا۔ چناں چہ میں نے بھائی جان کو فوراً ایک خط لکھا اور خاتمۂ مکتوب پر لکھا ''آپ کا فرزند برادر، محی الحق۔'' میری اس 'فرزند برادر' کی ترکیب نے ایسی شہرت پائی کہ دیکھتے دیکھتے پورے حلقۂ اعزّا میں، میں 'فرزند برادر' مشہور ہوگیا۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ وہ خط بھائی جان کو بھیجا گیا یا نہیں لیکن مجھے اس کا تجربہ زندگی بھر ہوتا رہا کہ میرے ساتھ ان کے پیار کی کیفیت برادرانہ سے زیادہ پدرانہ تھی، جس کا پہلا اظہار کچھ ہی دنوں بعد اس طرح ہوا کہ...

بھائی جان کو بنارس کی تعلیم بہت زیادہ پسند نہ آئی، لہٰذا وہ ایک آدھ سال بعد ہی مدرسہ دارالعلوم، مئو چلے گئے، جو ان دنوں اعظم گڈھ ضلع کا ایک قصبہ اور اب خود ایک ضلع ہے اور جہاں ان دنوں قاری ریاست علی صاحب مرحوم (غالباً) شیخ القرآن تھے۔ ان کا تعلق بحری آباد ہی کی نورباف برادری سے تھا اور انھوں نے مدرسۂ فرقانیہ، لکھنؤ سے ہمارے بڑے ابا (شاہ عبدالسلام کے دادا) مولانا شاہ محمد جان صاحب مرحوم کی زیرِ تربیت تعلیم حاصل کی تھی۔ قاری صاحب ایک نیک سرشت انسان تھے اور کچھ بحری آبادی ہونے کی وجہ سے اور پھر بطور خاص بڑے ابا کے شاگرد ہونے کی بنا پر ہم لوگوں کا بطور خاص بہت خیال رکھتے تھے۔ دارالعلوم کی عمارت بڑی وسیع اور متعدد بڑے کمروں پر مشتمل تھی۔ ان میں سے ہر کمرہ رات کو چار چھ طلبہ کی خواب گاہ کے کام آتا جو اپنے اپنے بستر فرش پر بچھا کر سو رہتے تھے۔ صبح ہوتے ہی بستر لپیٹ کر دیوار میں لگی، الماریوں میں رکھ دیے جاتے تھے اور پھر یہ کمرے درس گاہ کے طور پر استعمال ہونے لگتے تھے۔

جب میں پرائمری اسکول سے فارغ ہوا تو 'اعلیٰ' تعلیم کے لیے مجھے بھی گاؤں چھوڑنا پڑا۔ چوں کہ بھائی جان مئو میں تھے، لہٰذا مجھے بھی وہیں بھیج دیا گیا جہاں مرحوم

باپ کی وصیت کی تکمیل میں مجھے ایک انگریزی مڈل اسکول کی تیسری جماعت میں داخل کر دیا گیا۔ قاری صاحب مرحوم کی عنایتوں کی وجہ سے مدرسے کا طالب علم نہ ہونے کے باوجود مجھے بھی بھائی جان کے ساتھ دارالعلوم کے اقامت خانے میں رہنے کی اجازت مل گئی۔

میری عمر ان دنوں اگرچہ نو دس سال کی تھی لیکن مہینے دو مہینے میں ایک آدھ بار ایسا ضرور ہوتا تھا کہ میں "بستر سے اٹھ کر" تقاضۂ فطرت کی تکمیل کے لیے کہیں جاتا تھا لیکن عجیب بات یہ ہوتی تھی کہ صبح کو میرا پورا بستر گیلا ہوتا تھا۔ اس وقت مجھ پر یہ راز منکشف ہوتا تھا کہ میں جہاں کہیں گیا تھا، خواب میں گیا تھا۔ بھائی جان میری اس کم زوری سے واقف تھے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے فرائضِ منصبی میں یہ بات بھی شامل کر رکھی تھی کہ فجر کی اذان ہوتے ہی، وہ میرے بستر کا جائزہ لیں۔ اب اگر بستر گیلا ہوتا تو وہ انتہائی خاموشی کے ساتھ اسے نل کے نیچے لے جا کر کھنگال دیتے۔ ظاہر ہے، گیلا بستر سکھانے کے لیے وہ وقت موزوں نہ ہوتا، لہٰذا وہ گیلی چادر لپیٹ کر بستر میں چھپا کر رکھ دیتے تھے اور ظہر بعد جب مدرسے کی تعلیم ختم ہوتی تو اسے دوبارہ دھوکر سکھا لیتے تھے۔ ڈیڑھ سال کے دوران میں کم از کم چار چھ بار یہ حادثہ ضرور پیش آیا لیکن کسی استاد وغیرہ کو کیا، اس کمرے میں رہنے والے کسی اور لڑکے کو بھی میری اس شاہانہ عادت کا پتا نہ لگا اور ایک بار اماں سے ذکر کرنے کے علاوہ بھائی جان نے گھر میں بھی کسی کو بھنک نہ لگنے دی۔ اب آپ اسے کیا کہیں گے، برادرانہ سلوک یا پدرانہ شفقت۔ اور میں 'فرزند بردار' ہوا یا نہیں؟

ایک روز بھائی جان نے نمازِ فجر کے فوراً بعد مجھے غالباً ایک آنہ (آج کے چھ پیسے) دیا اور کہا کہ جلدی سے اس کے خرمے لے آؤ تاکہ مدرسے کا وقت شروع ہونے سے پہلے ناشتہ کرلیا جائے۔ بازار دارالعلوم سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ میں گیا تو حلوائیوں کی چند دکانوں کے علاوہ تمام دکانیں بند تھیں۔ مجھے خرما کہیں نہ ملا۔ اتفاق سے سڑک کے کنارے بیٹھی ہوئی کوئی بہت ہی ضرورت مند بڑھیا اتنے سویرے انتہائی

گھٹیا اور باسی امرود بیچ رہی تھی۔ مجھے خرما نہ ملا تو کوئی نہ کوئی چیز تو خریدنی ہی تھی، لہٰذا میں نے بڑھیا کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا اور خرمے کے نعم البدل کے طور پر کوئی سیر بھر امرود خرید لیے۔ خرمے کی تلاش میں کافی دیر ہوگئی تھی اور جب میں واپس آیا تو دارالعلوم میں پڑھائی شروع ہوچکی تھی۔ اتفاق سے قاری صاحب ہی کوئی کتاب پڑھا رہے تھے۔ میں امرود لے کر پہنچا تو بھائی جان نے مجھے آنکھ کے اشارے سے کہا کہ میں جو کچھ لایا ہوں، الماری میں رکھ کر کمرے سے بھاگ جاؤں لیکن میں اس قسم کے اشارے سمجھنے کا قائل نہ تھا۔ میں تو چاہتا تھا کہ میری کاوشوں پر خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے پڑھائی وغیرہ کو گولی مار کر پہلے بھائی جان میرے ساتھ امرود کھا لیں۔ اچانک قاری صاحب مرحوم کی نظر پڑی تو انھوں نے بڑی رسان سے کہا کہ ''یہ تو امرود کا موسم نہیں ہے، اسی لیے یہ امرود بہت اچھے بھی نہیں ہیں۔'' بھائی جان نے گردن جھکا کر یہ بات اس طرح سنی گویا امرود منگوانے کا یہ فیصلہ انھوں نے خود ہی کیا تھا اور اس میں میری کسی حماقت کو دخل نہیں تھا۔

دوپہر کو جب میں اپنے اسکول سے واپس آیا اور کمرے میں کوئی اور لڑکا نہیں تھا تو بھائی جان نے میری عرض داشت سنی۔ میرے یہ کہنے پر کہ خرمے کی کوئی دکان کھلی ہی نہ تھی، انھیں بڑا تعجب ہوا اور دوسرے دن وہ خود مجھے اپنے ساتھ لے کر بازار گئے۔ پہلی دکان حلوائی کی تھی جہاں تازہ تازہ ایک مٹھائی بن رہی تھی۔ انھوں نے ایک آنے کی غالباً ایک پاؤ وہی مٹھائی خریدی اور کہا کہ ''یہ خرما مل تو رہا ہے۔'' مجھے بڑا غصہ آیا کیوں کہ جس چیز کو وہ خرما کہہ رہے تھے، اسے ہم لوگ گاؤں میں شکر پالا کہتے تھے اور جسے ہم لوگ گاؤں میں خرما کہتے تھے اس کا شہری نام چھوہارا تھا۔ ظاہر ہے، اس توضیح کے بعد بھائی جان مسکرانے کے علاوہ اور کیا کرسکتے تھے۔ بہرحال اس انداز میں میری تربیت ہوتی رہی کہ ایک دن بھائی جان یکایک غائب ہوگئے۔

جاتے ہوئے وہ مجھ سے اتنا کہہ گئے کہ ''میں ایک ضروری کام سے کچھ دنوں کے لیے کہیں جا رہا ہوں۔ تم جب گھر جاؤ تو اماں سے کہنا کہ وہ پریشان نہ ہوں۔''

کوئی ایک ہفتے کے بعد میرے امتحانات ختم ہوگئے اور میں گاؤں پہنچا تو بھائی جان کے بارے میں لوگوں کو تشویش شروع ہوئی۔ آخر شاید کوئی ڈیڑھ دو ماہ بعد بدایوں کے کسی مدرسے سے وہاں کے ایک مدرس کا خط آیا جس سے بھائی جان کے وہاں ہونے کی خبر ملی۔ پھر وہ خود چھٹیوں میں آئے تو تفصیل معلوم ہوئی جو صرف یہ تھی کہ وہ مئو کی تعلیم سے بھی مطمئن نہ تھے۔ انھیں اندیشہ تھا کہ اگر وہ اجازت مانگیں گے تو نہیں ملے گی۔ لہٰذا وہ اللہ کا نام لے کر ''نہ منزل نہ جادہ، چلے بے ارادہ'' کی کیفیت میں ٹرین میں بیٹھ کر چل پڑے علم حاصل کرنے۔

قسمت اچھی تھی، کہیں ٹھوکر نہیں کھانی پڑی۔ یوں بھی کہا گیا ہے کہ سفر شرط ہے، مسافر نواز بہت مل جاتے ہیں۔ چناں چہ مئو سے چل کر خدا جانے بھائی جان کہاں پہنچے کہ ٹرین میں ایک مولوی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان سے بات چیت ہوئی تو اپنے پتے اور گھریلو تشخص کو چھپا کر بھائی جان نے خود کو تحصیلِ علم کے ایک شوقین لڑکے کے طور پر پیش کیا۔ وہ صاحب بدایوں کے کسی مدرسے میں مدرس تھے۔ چناں چہ وہ بھائی جان کو اپنے ساتھ لے گئے۔ مدرسے میں داخل کرا دیا اور دارالاقامہ میں رہنے اور کھانے کا انتظام کردیا۔ کچھ دن تو بھائی جان ضبط کیے رہے، آخر ایک روز پھوٹ پڑے۔ مولانا کو معلوم ہوا کہ یہ اپنے گھر سے بے اطلاع غائب ہیں، تو انھوں نے فوراً ان سے پتا معلوم کرکے چچا کو خط لکھااور ہر طرح سے اطمینان دلایا۔ پھر بھائی جان کی خط و کتابت بھی شروع ہوگئی۔ ظاہر ہے گھر میں کسی کو اور خصوصاً اماں یا چچا کو اس سے کیا بحث تھی کہ وہ مئو میں پڑھیں یا بدایوں میں۔ ان لوگوں کی خواہش تو بس یہ تھی کہ وہ پڑھتے رہیں۔

کچھ دنوں بعد ہم لوگوں کے ایک چچا زاد بھائی کی شادی کے موقعے پر ہمارے ایک بزرگ قمر احمد صاحب نے جن کا خاکہ اس مجموعے میں شامل ہے، ایک سہرا لکھا تھا۔ اس سہرے میں قمر چچا نے بھائی جان کے بارے میں جو شعر کہا تھا اس کا دوسرا مصرع مجھے یاد نہیں، بہرحال پہلے مصرعے میں بدایوں کے حوالے سے ان کا ذکر

اس طرح کیا گیا تھا:

''مشیر الحق بھی آئے ہیں بدایوں کے للا بن کر''

ظاہر ہے یہ بات قمر چچا نے محض برائے بیت کہی تھی، ورنہ اپنے رکھ رکھاؤ اور عزم و ارادے کی پختگی کے باعث بھائی جان بدایوں کے اُن روایتی للاؤں کے بالکل برعکس تھے جو چودہ سال کی عمر میں اپنی اناّ کی گود میں گھومتے تھے اور اگر کوئی بزرگ پیار بھرے لہجے میں ان سے ان کا نام پوچھ لیتا تو وہ اناّ کی بغل میں منھ دے کر شرمائے ہوئے لہجے میں کہتے،''اناّ ٹو ای بٹا ڈے'' (اناّ تو ہی بتا دے)۔

بھائی جان کسی طرف سے بھی للا نہیں تھے۔ وہ اپنی زندگی کے فیصلے خود کرتے اور پوری سنجیدگی اور پامردی کے ساتھ ان پر عمل کرتے۔ بدایوں کی تعلیم بھی انھیں مطمئن نہ کرسکی۔ اب ان کی عمر بھی اتنی ہوچکی تھی کہ وہ مختلف مدارس کا موازنہ کرکے ان کے بارے میں رائے قائم کرسکتے۔ چناں چہ بہت جلد ہی وہ پھر'پا بہ ٹرین' ہوئے اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں بدایوں سے چل کر لکھنؤ پہنچے اور وہاں ندوۃ العلما میں داخل ہوگئے۔ یہاں انھوں نے درجہ متوسط تک تعلیم حاصل کی اور پھر مدارس کی روایتی تعلیم سے اکتا کر اسے بھی چھوڑا۔ طبیعت میں کچھ حاصل کرنے کا اضطراب تھا، کوئی ایسی چیز جس کے حصول کے بعد وہ اطمینان سے کہہ سکیں کہ''شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم۔'' کچھ دنوں کے لیے اعظم گڈھ آئے، جہاں ان دنوں میں غالباً آٹھویں درجے میں پڑھتا تھا۔ یہاں وقت گزاری کے لیے وہ ایک مکتب (واقع محلّہ میر پٹو) کے صدر مدرس ہوگئے۔ اس مکتب کے تفصیلی حالات مولانا ابوالجلال ندوی کے خاکے میں درج ہیں۔ مکتب کے قریب ہی ایک محلّے (آصف گنج) میں ایک مکان کرائے پر لے کر ہم دونوں بھائی رہنے لگے۔ کھانا پکانے کے لیے ایک بڑھیا ملازمہ رکھی گئی۔ اس طرح مئو کے بعد ایک بار پھر ہم دونوں بھائیوں کا روز و شب کا ساتھ ہوا۔ کچھ دنوں کے لیے اماں بھی گویا اپنے بڑے بیٹے کی ملازمت پر آئیں اور ہم لوگوں کے ساتھ رہیں۔ بھائی جان کی مکتب والی تنخواہ تو اتنی نہ تھی کہ وہ گھر کا پورا خرچ برداشت کرسکتے،

لہٰذا ظاہر ہے ان اخراجات میں اماں کی امداد (Subsidy) بھی شامل تھی لیکن ایک بیوہ خاتون کی اس طمانیت اور مسرت کا اندازہ کیجیے کہ شوہر کے انتقال کے بعد اب وہ اپنے بیٹے کی ملازمت پر آئی تھیں۔

ظاہر ہے یہ مشغلہ وقت گزاری کا تھا لیکن یہاں بھی اپنی کم عمری کے باوجود بھائی جان بڑی نفاست اور انتہائی سلیقے کے ساتھ رہتے تھے۔ رفقائے دارالمصنفین اعظم گڈھ کی طرح وہ بھی شیروانی اور ٹوپی کے بغیر گھر سے باہر نہ نکلتے۔ میں نے ایک معمولی سے مکتب میں کم عمری کی صدر مدرسی میں بھی انھیں اتنا ہی باوقار دیکھا جتنا ایک یونی ورسٹی کی وائس چانسلری کے زمانے میں۔ نہ پہلے وہ کسی احساسِ کم تری میں مبتلا تھے اور نہ بعد میں کسی احساسِ برتری کا شکار ہوئے۔ بہرحال چند ہی مہینوں میں انھوں نے یہ صدر مدرسی چھوڑی، جہاں کے دوسرے مدرسین ان سے دگنی عمر کے تھے اور 'عنقا را بلند است آشیانہ' کہتے ہوئے پھر لکھنؤ چلے گئے۔ اس بار انھوں نے کسی مدرسے کی روایتی تعلیم کا سہارا لینے کی بجائے کسی صاحبِ نظر مدرس کا دامن پکڑنے کا فیصلہ کیا اور یہ دامن تھا مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم کا جنھوں نے خود ندوۃ العلما کی مدرسی چھوڑ کر امین آباد پارک (لکھنؤ) میں ادارۂ تعلیماتِ اسلام کے نام سے قرآنِ پاک اور عربی پڑھانے اور مسلمان بچوں اور بڑوں کی تربیت کی غرض سے آسان اردو میں کتابیں لکھنے اور چھاپنے کے لیے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ بھائی جان مولانا اور ان کے ادارے سے منسلک ہوگئے۔ یہاں وہ پڑھتے بھی رہے، پڑھاتے بھی رہے۔ لکھتے بھی رہے اور لکھاتے بھی رہے۔

اسی اثنا میں پاکستان بن گیا۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم نے پاکستان میں بھی قرآن فہمی کی تعلیم دینے کے لیے ادارۂ تعلیماتِ اسلام کی ایک شاخ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ تجربے کے طور پر انھوں نے اپنے ادارے کے دو رفقا یعنی بھائی جان اور مولانا صلاح الدین احمد ندوی کو پاکستان جانے کے لیے کہا۔ ادھر میں نے بھی اسی سال (۱۹۴۷ء) میٹرک کرلیا تھا۔ پاکستان بنا تو میں نے ترکِ وطن کا فیصلہ کیا۔

بھائی جان کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی جانے کا عزم کر چکے ہیں۔ اس طرح اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ہم دونوں بھائی بمبئی سے بحری جہاز کے ذریعے ایک ساتھ پاکستان آگئے۔ میرا میٹرک کا سرٹیفکیٹ کام آیا اور میں کلرکی کرتا رہا اور ہم دونوں بھائی ڈبل روٹی تو نہیں لیکن عیدگاہ میدان کے بھٹیار خانوں میں تندوری روٹی کھاتے رہے۔ بھائی جان نے کراچی کی دکھنی مسجد (واقع آؤٹرام روڈ) میں قرآنِ پاک کا ترجمہ اور عربی پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ تعلیم حسبۃً للہ تھی لیکن بدقسمتی سے بھائی جان اور ان کے ساتھی کی پرخلوص اور اَن تھک محنت کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ یوں بھی نیا نیا ملک بنا تھا لوگ فکرِ معاش اور آشیاں بندی کی جدوجہد میں اتنے منہمک تھے کہ عربی علم کی تحصیل جیسی اعلیٰ و ارفع باتوں کے لیے وقت کس کے پاس تھا۔

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

والا معاملہ تھا۔ اس سرد مہری اور عدم توجہی کو دیکھ کر بھائی جان کی طبیعت میں پھر بے چینی شروع ہوئی۔ اگر وہ چاہتے تو یہاں کسی مدرسے، اخبار یا رسالے میں ملازم ہوکر زندگی کی تگ و دو میں لگ سکتے تھے لیکن یہ تو ان کا مطمحِ نظر تھا ہی نہیں۔ چناں چہ چند ماہ بعد وہ پھر لکھنؤ واپس چلے گئے اور ادارۂ تعلیماتِ اسلام میں دوبارہ اپنی سرگرمیاں شروع کردیں۔ اس زمانے کی خاصی تفصیل ان کے اس مضمون میں موجود ہے جو انھوں نے مختلف افراد پر مولانا عبدالسلام قدوائی کے مضامین کے مجموعے "چند تصویرِ نیکاں" (مطبوعہ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء) کے دیباچے کے طور پر لکھا ہے۔ بھائی جان کے برعکس میں پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ اس طرح ۱۹۴۸ء میں ہم دونوں مکانی طور پر ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے بہت دور ہوگئے۔

خط و کتابت کے معاملے میں، میں غیرمعمولی طور پر کوتاہ قلم واقع ہوا ہوں۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۸ء تک ماں، بھائی، بہن اور چچا وغیرہ سمیت گھر والوں میں کسی سے میری ملاقات نہ ہوئی۔ اس درمیان میں اماں اور بھائی جان نے چار پانچ خط فی سال

کے حساب سے کم از کم پچاس خط تو ضرور مجھے لکھے ہوں گے اور میں نے بھی انھیں تین سال فی خط کے حساب سے چار پانچ خط لکھ ڈالے۔ میں یہاں اپنی تگ و دو میں لگا رہا اور بھائی جان وہاں ایک منصوبے کے مطابق آگے بڑھتے رہے۔ ۱۹۴۹ء میں وہ اور ۱۹۵۳ء میں، میں اپنے اپنے ملک میں گھر والے ہوگئے۔ ان کی شادی میں، میں شریک ہوسکا اور نہ میری شادی میں تحریری اجازت کے علاوہ وہاں سے کوئی خود آسکا۔

پاکستان سے جون ۱۹۴۸ء میں واپس جانے کے بعد بھائی جان حسبِ سابق ادارۂ تعلیماتِ اسلام سے منسلک ہوگئے تھے۔ یہ زمانہ وہ تھا جب بقول بھائی جان ''مسلمانوں کے پیر اکھڑ چکے تھے، بھگدڑ مچی ہوئی تھی... ذہنی طور پر مسلمان شکست خوردہ ہوچکے تھے۔ لہٰذا ادارے کے عمائدین نے طے کیا کہ ایک ایسا پندرہ روزہ رسالہ نکالا جائے جس میں مسلمانوں کو بتایا جائے کہ ''یہ مصیبت ایک وقتی مصیبت ہے، آنی جانی ہے، اپنے اوپر اعتماد کرکے انھیں رہنا ہوگا۔'' اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے ''تعمیر'' کے نام سے ایک پندرہ روزہ رسالہ نکالا گیا جس کے ایڈیٹر مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی تھے۔ بھائی جان اس کے اسسٹنٹ ایڈیٹر، منیجر، پیکر یعنی وہ سب کچھ تھے جو مالی لحاظ سے کم زور اردو (مسلمان) رسالوں کے ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ تقریباً پانچ سال تک نکلتا رہا اور بھائی جان اس کے انتظامی امور کے علاوہ ادارتی امور بھی نمٹاتے رہے کہ اس اثنا میں ادارے کی مالی حالت اتنی سقیم ہوچکی تھی کہ خود اس کے بانی مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی جامعہ ملیہ دہلی میں استاد ہوکر جاچکے تھے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی توجہ کا اصل مرکز ندوۃ العلما تھا۔ لہٰذا ''تعمیر'' کے انتظامی اور ادارتی ہر قسم کے امور بھائی جان کی ذمہ داری بن گئے۔

ان حالات میں انھیں احساس ہوا کہ باقاعدہ انگریزی تعلیم حاصل کیے بغیر موجودہ معاشرے میں کچھ کرنا آسان نہیں ہے۔ چناں چہ انھوں نے یو پی بورڈ سے پرائیویٹ میٹرک اور انٹرمیڈیٹ اعلیٰ نمبروں سے پاس کرلیا اور ایک بار پھر دراصل مزید تعلیم ہی کے لیے ملازمت کا بندھن توڑ کر جامعہ ملیہ دہلی میں ریگولر طالب علم کے طور پر

بی اے میں داخل ہوگئے۔ اب ان کی عائلی ذمہ داریاں بھی بڑھ چکی تھیں۔ بڑا بیٹا تین، چار سال کا ہوکر بڑی آباد کے دیہات میں طبی سہولتوں کے فقدان کا نشانہ بن چکا تھا۔ زمیں داری کے خاتمے سے گھر کی معاشی حالت ناگفتہ بہ حد تک خراب ہوچکی تھی۔ وہ خود ٹیوشن اور کچھ معمولی تحریری کام کرکے اپنی تعلیم میں منہمک تھے۔ ان حالات میں وہ اپنے بیوی بچوں اور والدہ کو آبائی گاؤں میں رکھنے پر مجبور تھے۔ موت تو ہر جگہ اور ہر حالت میں آنی ہے لیکن میں سوچتا ہوں کہ ایک دور افتادہ دیہات میں جب ان کے بچے نے دوا کا ایک گھونٹ پیے بغیر دم توڑا ہوگا تو ان کے دل کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی۔

بہرحال وہ ایک عزم کرچکے تھے اور اسے ہر قیمت پر پورا کرنا چاہتے تھے۔ وہ جامعہ ہی میں کلرک ہوگئے اور پھر جامعہ کے وائس چانسلر پروفیسر مجیب کے پی اے مقرر ہوئے۔ لیکن یہ سب تو سنگِ میل تھے۔ منزل تو بہت دور تھی۔ انھوں نے جامعہ سے (غالبًا) بغیر تنخواہ کے چھٹی لی اور مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔ وہاں سے انھوں نے عربی میں فرسٹ کلاس فرسٹ ایم اے کیا اور طلائی تمغہ حاصل کیا۔ اس کامیابی کے بعد وہ پھر جامعہ واپس آئے اور ایشیا فاؤنڈیشن کی جانب سے پروفیسر مجیب کو تفویض کردہ ایک کتاب لکھنے کے منصوبے میں ان کے ریسرچ اسسٹنٹ ہوگئے۔ وہیں سے خود بھائی جان کو ایشیا فاؤنڈیشن کا وظیفہ ملا اور انھوں نے کناڈا جاکر میک گل یونی ورسٹی سے اسلامیات میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا اور یہ اس وقت جب وہ دو (یا غالبًا) تین بچیوں کے باپ ہوچکے تھے۔

میں ابھی کچھ اوپر بتا رہا تھا کہ ۱۹۴۷ء سے میرے روابط گھر والوں سے تقریباً ختم ہوگئے تھے۔ بہرحال ۱۹۵۸ء کے اواخر میں میری والدہ ہم لوگوں سے ملنے کراچی آئیں اور کوئی سوا دو سال کے بعد ۱۹۶۱ء میں جب ان کی واپسی ہوئی تو عجلت اور رواروی میں پروگرام اس طرح بنا کہ میں اماں کو لے کر لاہور گیا جہاں انھیں لینے بھائی جان دلّی سے آئے۔ تیرہ سال کے بعد ہم دونوں کی لاہور پلیٹ فارم پر ملاقات ہوئی۔ گلے ملے، چند منٹوں تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ گویا کچھ حجاب حجاب کی سی کیفیت

تھی اور پھر جو ہم دونوں ٹوٹ کر ایک دوسرے سے ملے تو یہ طویل زمانی فاصلہ سیکنڈوں میں ختم ہوگیا۔ میں اپنی آپا سمیت اپنے تمام بڑوں سے فصیح اردو میں باتیں کرنے کا عادی ہوں اور طرزِ تخاطب بھی ''آپ، جی'' والا ہوتا ہے۔ صرف اپنی والدہ اور بھائی جان سے ہمیشہ پوربی لہجے میں بات کرتا تھا اور اسی لہجے میں انھیں مخاطب کرتا تھا، ''آپ کہاں گئے تھے'' کی بجائے ''توں کہاں گئے رہیو''، ''تم آؤ گے یا نہیں'' کی جگہ ''ایہو کہ نا'' وغیرہ... لاہور کے پلیٹ فارم پر بھائی جان سے ملاقات سے پہلے میں سوچ رہا تھا کہ اتنے طویل عرصے کے بعد ملاقات ہوگی تو اب وہ پوربی والی بات کہاں چلے گی لیکن مجھے یاد ہے کہ میں نے ان سے پہلا جملہ ہی بے ساختہ اسی لہجے میں ادا کیا اور ان کا جواب بھی اسی لہجے میں ملا۔ ہم لوگ چار پانچ دن لاہور میں رہے اور کہنے کو دن بھر تاریخی مقامات مثلاً شاہی مسجد، شاہ درہ، شالیمار اور قلعے وغیرہ کی سیر بھی کرتے تھے لیکن وہ تمام جگہیں میری تو پہلے سے دیکھی ہوئی تھیں اور بقول بھائی جان کے اس قسم کی بہت سی عمارتیں دہلی اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی موجود تھیں جن سب کو وہ دیکھ چکے تھے۔ لہٰذا ان کے لیے بھی کوئی نئی بات نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم جہاں کہیں گئے۔ گھنٹوں گھومے، پھرے اور بیٹھے لیکن عمارتوں کو دیکھنے کی بجائے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ جس وقت ہم خاموش بھی ہوتے تھے تو ایک دوسرے سے خاموشی میں باتیں کرتے رہتے تھے۔

لاہور سے ان کی واپسی چار پانچ روز کے اندر اندر ہوگئی جس کے کچھ ہی دنوں کے بعد وہ کناڈا چلے گئے۔ جب وہ پی ایچ ڈی کرکے واپس آئے تو اماں کی خواہش ہوئی کہ ہم دونوں بھائی ایک جگہ ہوجائیں۔ انھوں نے بھائی جان کو بتائے بغیر مجھے اُکسایا اور میں نے بھائی جان سے بالا بالا ان کے لیے پاکستان میں کوشش کی اور ملازمت اور وطنیت وغیرہ کے تمام مراحل کے بارے میں اصولی گفتگو مکمل بھی کرلی لیکن ابھی رسمی کارروائی شروع نہیں ہوئی تھی کہ ان کے کناڈا کے ایک استاد کو جو مشہور مستشرق ہیں، اس بات کا علم ہوگیا اور انھوں نے مخالفانہ رائے دی۔ میں نے سوچا کہ اس مرحلے

کو بھی میں طے کرلوں ورنہ ہوسکتا ہے کہ وہ بھائی جان کو لکھ بھیجیں اور میری ساری محنت اکارت ہوجائے۔ اتفاق سے انھیں دنوں وہ مستشرق راول پنڈی آئے جہاں میں بھی اپنی ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھا۔ وہ ایک عیسائی مشنری کے گھر مہمان تھے۔ میں وہاں ان سے ملنے گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک ہم دونوں کے درمیان تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ذاتی وجہ کی بنا پر مشیر پاکستان آنا چاہتے ہیں تو میں اس معاملے میں کچھ نہیں کہوں گا کیوں کہ میرا اختلاف اصولی بنیاد پر ہے۔ پھر اس اجمال کی تفصیل میں ان مستشرق نے جو طویل دلائل دیے، وہ آج بھی مجھے بخوبی یاد ہیں لیکن اس کا اعادہ ہر لحاظ سے خلافِ مصلحت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسے تفصیل کے ساتھ میں اپنی خودنوشت میں لکھوں۔ میں ان کے بعض نکات سے متفق تھا اور بعض سے مجھے اختلاف تھا جس کا اظہار میں نے اسی جگہ کردیا تاہم بعد کے حالات نے اختلافی نکات میں سے بھی چند اور نکات میں ان کی رائے کی تصدیق کردی۔ بہرحال گزشت انچہ گزشت۔ یہ خواہش تو دراصل اماں کی تھی۔ لہٰذا انھیں کوئی ایک عشرہ اور ہم دونوں کے درمیان آوا جائی کرنا تھا۔ آخر ۱۹۷۹ء میں وہ عارضی طور پر میرے یہاں اسلام آباد آئیں اور وہیں انھوں نے وفات پائی۔

اصولاً یہ خاکہ مجھے یہیں ختم کر دینا چاہیے کیوں کہ اب ہم دونوں کی زندگیوں کا ابتدائی دور ختم ہوچکا ہے جس تک اپنے بیان کو محدود رکھنے کا میں نے ارادہ کیا تھا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ اگرچہ ہندوستان کے اکثر پڑھے لکھے مسلمان حضرات بھائی جان کے علمی کارناموں سے واقف ہیں لیکن پاکستانیوں کی اکثریت ان سے تقریباً ناواقف ہے لہٰذا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ بھائی جان کے علمی کارناموں کے علاوہ ان کی شہادت جس پس منظر میں ہوئی اسے قدرے اختصار سے یہاں بیان کر دوں تاکہ ریکارڈ نامکمل نہ رہے۔

کناڈا سے واپس آنے کے بعد چوں کہ بھائی جان کو پاکستان بلانے کا میرا منصوبہ کامیاب نہ ہوا۔ لہٰذا انھوں نے ہندوستان ہی میں دوبارہ عملی زندگی کا آغاز

''پنجابی یونی ورسٹی'' پٹیالہ کے شعبۂ تقابلی مذاہب کے ریڈر انچارج کے طور پر کیا لیکن کچھ ہی دنوں بعد انھیں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز، شملہ سے فیلو کی جگہ کی پیش کش ہوئی جسے انھوں نے قبول کرلیا۔ یہاں سے تقریباً پانچ سال کے بعد ۱۹۷۳ء میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ ''سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز'' میں ریڈر ہوکر چلے گئے۔ ۱۹۷۶ء میں انھیں ان کی پرانی مادرِ علمی جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ''شعبہ اسلامک اسٹڈیز'' میں پروفیسر کی حیثیت سے مقرر کیا اور وہ اس شعبے کے صدر بھی مقرر ہوئے۔ جامعہ میں انھوں نے ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۷ء تک بہ طور پروفیسر کام کیا۔

۱۹۸۷ء میں بھائی جان کا انتخاب کشمیر یونی ورسٹی، سری نگر کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ہوگیا۔ جہاں انھوں نے تین سال کا عرصہ پوری عزت آبرو کے ساتھ گزارا۔ میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر بلاخوفِ تردید یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ایک زمانے کے بعد کشمیر یونی ورسٹی کو ایک ایسا وائس چانسلر نصیب ہوا جس کے عہد میں یونی ورسٹی میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، پوری تندہی اور یکسوئی کے ساتھ تعلیم ہوتی رہی۔ ایک دن کے لیے بھی یونی ورسٹی کسی قسم کی ہڑتال یا تالہ بندی وغیرہ کے مرحلوں سے نہ گزری جو اس سے پہلے اس یونی ورسٹی کا معمول تھا۔ دراصل بھائی جان کو یہاں ایک موقع ملا تھا کہ وہ اپنے ہم مذہب نوجوانوں کی تعلیم کی طرف پوری توجہ دیں اور الحمد للہ کہ وہ اس کارِ دشوار سے بہ خوبی عہدہ برآ ہوئے۔ یونی ورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ دونوں سے ان کے تعلقات انتہائی خوش گوار رہے۔ ۳۰/اپریل ۱۹۹۰ء کو ان کا تین سالہ معاہدہ پورا ہونے والا تھا۔ حکومت کی طرف سے انھیں غالباً اضافی مدت کی پیش کش بھی ہوئی تھی لیکن انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

کراچی کے اہلِ علم حضرات محترم لطف اللہ خاں صاحب سے واقف ہیں جو اپنے شوق کی بنا پر بڑے بڑے عمائدین کی آوازیں ٹیپ پر محفوظ رکھنے کے لیے مشہور ہیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ریکارڈنگ اور تصویر کشی کا اپنا ایک جامع نظام قائم کر رکھا ہے۔ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ خاں صاحب بطورِ اصول کسی صاحبِ آواز

کے کسی رشتے دار، دوست یا دشمن کو حتیٰ کہ خود صاحبِ آواز کو کسی قیمت پر کسی وقت بھی (یعنی صاحبِ آواز کی زندگی میں یا اس کی موت کے بعد) ٹیپ کی نقل کی اجازت نہیں دیتے۔ تاہم مخصوص حالات میں وہ اس بات کی اجازت دے دیتے ہیں کہ متعلقہ ٹیپ سن کر کوئی شخص اپنے قلم سے پورا، یا جس حد تک درکار ہو اس حد تک، متن لکھ لے۔

غالباً ۱۹۸۸ء میں ہمدرد فاؤنڈیشن کے ایک سیمینار میں شرکت کے لیے بھائی جان کراچی آئے۔ جلسے میں ان کی ملاقات لطف اللہ خاں صاحب سے ہوگئی۔ ان کی دعوت پر ان کے گھر جا کر بھائی جان نے اپنی آواز ''قید'' کروائی جس میں انھوں نے اپنے بچپن سے لے کر سری نگر کی وائس چانسلری تک کے جستہ جستہ حالات ریکارڈ کروا دیے۔ اس میں اضافے کا معاملہ دوسری نشست تک مؤخر رہا جو دوبارہ کبھی قائم نہ ہوسکی۔

بھائی جان کی تدفین کے موقع پر میرے بڑے بیٹے تسنیم الحق فاروقی دہلی گئے تو عزیزی شاہ عبدالسلام سے اس ٹیپ کا ذکر آیا۔ انھوں نے اپنے مجموعے میں شامل کرنے کے لیے اس ٹیپ کی نقل مانگی۔ کراچی آکر عزیزی تسنیم الحق لطف اللہ خاں صاحب سے ملے تو انھوں نے بہ کمالِ مہربانی ٹیپ سننے اور اسے اپنی تحریر میں لکھنے کی اجازت دے دی۔ چناں چہ تسنیم نے اپنے چھوٹے بھائی سلیم الحق فاروقی کی معاونت سے اس ٹیپ کو مکمل طور پر اپنی تحریر میں لکھ لیا جو ''ڈاکٹر مشیر الحق... شخصیت اور فکری بصیرت'' میں شائع ہوا۔ ہم سب اہلِ خاندان لطف اللہ خاں صاحب کے شکر گزار ہیں جن کی مہربانی سے بھائی جان کی سوانح میں ''ان کی کہانی انھیں کی زبانی'' کا دلچسپ اور معلوماتی اضافہ ہوسکا۔

اس ٹیپ شدہ بیان سے ایک واقعہ سنیے جس سے ایک طرف بھائی جان کی معصومیت اور دوسری طرف ان کے عزم و ہمت کا اظہار ہوتا ہے۔ جون ۱۹۴۸ء میں پاکستان سے واپس جاتے وقت بھائی جان کو یہ اندیشہ تھا کہ بمبئی تک بحری جہاز میں ہندو ہی ہندو ہوں گے، لہٰذا انھیں کوئی گزند پہنچ سکتی ہے۔ انھوں نے اپنی قیام گاہ سے

بندرگاہ تک کا سفر سب سے سستی سواری یعنی گدھے گاڑی میں کیا۔ راستے میں گدھے گاڑی والے سے جو مکرانی تھا، پوچھا کہ ''کیا جہاز پر سامان چڑھانے والے قلیوں میں سے تم کسی کو جانتے ہو؟'' اس نے اثبات میں جواب دیا تو انھوں نے کہا کہ، ''تم اس سے کہنا کہ جہاز میں مجھے ایسی جگہ بٹھا دے جہاں کچھ مسلمان بھی ہوں۔'' اس نے وعدہ کرلیا۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے یاددہانی کرائی۔ پھر بھی اطمینان نہ ہوا تو تیسری بار پھر وہی فرمائش کر بیٹھے۔ اس نے پوچھا کہ ''تم ہندوستان کتنے دنوں کے لیے جا رہے ہو؟'' بھائی جان نے کہا، میں وہاں مستقل رہنے کے لیے جارہا ہوں۔'' یہ سن کر مکرانی گاڑی بان نے جھنجھلا کر کہا، ''تم عجیب آدمی ہو۔ دو دن کے سفر کے لیے تو تم مجھ سے یہ کہہ رہے ہو کہ ایسی جگہ دلوا دینا جہاں مسلمان موجود ہوں لیکن میں تمھیں ہندوستان میں کہاں کہاں ایسی جگہ دلاؤں گا۔'' بھائی جان کا بیان ہے کہ اس جاہل گاڑی والے کا یہ جملہ میرے دل پر اثر کر گیا۔ اور پھر اس کے اصرار کے باوجود انھوں نے کسی قسم کی مدد لینے سے انکار کردیا۔ اتفاق سے انھیں جہاز میں ایسی جگہ ملی جہاں سارے سندھی ہندو تھے جو پاکستان سے انتقالِ مکانی کرکے جارہے تھے۔ ان سب نے بھائی جان کا بڑا خیال رکھا بلکہ راستے میں ان کی طبیعت خراب ہوئی تو سندھی عورتوں نے انھیں لیمو پلایا۔ بھائی جان کا بیان ہے کہ سندھی مکرانی گاڑی والے کے جملے نے انھیں ہندوستان میں رہنے کے لیے طاقت عطا کی۔

اسی ٹیپ شدہ بیان سے ایک واقعہ اور سنیے جس سے بھائی جان کے اندر سنگین اور نازک معاملات سے نمٹنے کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک روز وہ دفتر آئے تو معلوم ہوا کہ کچھ مضطرب لڑکے ان سے فوراً ملنا چاہتے ہیں کیوں کہ لائبریری میں کوئی کتاب آگئی ہے جس میں اسلام اور نبیِ اکرم ﷺ کے خلاف کچھ توہین آمیز مواد موجود ہے۔ بھائی جان نے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری کے ذریعے لڑکوں کو کہلوایا کہ کتاب مجھے دے دو، پڑھنے کے بعد تم لوگوں سے کل گفتگو کروں گا۔ کتاب تو نہیں آئی لیکن دوسرے دن لڑکوں نے پھر وی سی آفس کا گھیراؤ کرلیا۔ اس بار کتاب اُن کے

پاس تھی۔ وہ وی سی سے فوراً ملنا چاہتے تھے۔

وی سی آفس میں موجود انتظامی شعبوں کے افراد نے مشورہ دیا کہ ایک کمیٹی بنا دی جائے جو ابتدائی گفت وشنید کرے۔ بھائی جان نے اس مشورے کو یہ کہہ کر قبول نہیں کیا کہ جو معاملہ آج آسانی کے ساتھ ختم ہوسکتا ہے اسے ہم لیت ولعل میں ڈال کر سنگین سے سنگین تر بنا دیں گے۔ لوگوں نے کہا کہ لڑکے بپھرے ہوئے ہیں، شاید کوئی بدتمیزی کریں۔ بھائی جان نے کہا کہ ان تمام خدشات کے باوجود ان سے ابھی مل لینا بہتر ہے بہ مقابلہ اس کے کہ میں کمرے کو بند کرکے اندر بیٹھا رہوں۔

پندرہ سولہ لڑکوں کا ایک نمائندہ وفد کتاب لیے ہوئے اندر آیا۔ وہ کسی ہندو خاتون کی تصنیف تھی، Folk Tales of Afghanistan (افغانستان کی لوک کہانیاں) کتاب کا نام تھا۔ بھائی جان کو تعجب ہوا کہ بہ ظاہر ان دونوں میں کوئی ربط نہیں تھا۔

دراصل کتاب میں ایک کہانی ہجرتِ نبوی کے موقعے پر غارِ ثور والے واقعے کی تھی جس میں سانپ کی ایک بل پر حضرت ابوبکرؓ نے اپنا انگوٹھا لگا دیا تھا اور سانپ نے انھیں کاٹ لیا تھا۔ کتاب میں غارِ ثور کا نقشہ اور مکڑی کا جال بنا ہوا تھا۔ اندر کچھ دھندلی دھندلی تصویریں نظر آ رہی تھیں۔ باہر ایک سانپ مرا ہوا پڑا تھا۔ لڑکوں کو اعتراض یہ تھا کہ تصویر غیراسلامی چیز ہے اور اس سے بھی بڑا اعتراض یہ کہ ہماری روایات میں سانپ کے مرنے کا ذکر نہیں آتا جب کہ کتاب والوں نے غار کے باہر مردہ سانپ دکھایا تھا۔

بھائی جان نے انتہائی شگفتہ انداز میں کچھ گفتگو کرکے اور کچھ تجویز دے کر معاملے کو نمٹا دیا۔ نمائندہ وفد تو مطمئن ہوگیا لیکن انھوں نے کہا کہ، ''صاحب! وہ جو کئی سو لڑکے باہر کھڑے ہیں، انھیں باہر چل کر آپ سمجھا دیجیے ورنہ ہم ان سے جاکر کیا کہیں گے۔ بھائی جان کے سیکورٹی اسٹاف اور پراکٹر وغیرہ نے مخالفت کی اور کہا کہ یہ تو آپ بہت بڑا رسک لیں گے کیوں کہ کئی سو لڑکوں کو کنٹرول کرنا آسان نہیں ہوگا۔ بھائی

جان نے بیان کیا کہ پہلے تو ان کے دل میں بھی دھکڑ پکڑ رہی لیکن پھر وہ:

ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

کہہ کر بپھرے ہوئے لڑکوں کے مجمعے میں چلے گئے اور ان سے دلچسپ انداز میں گفتگو کر کے وہاں ہنسی اور قہقہے کا ماحول پیدا کر دیا اور سارا معاملہ ٹائیں ٹائیں فش ہوگیا۔

اس واقعے کو تفصیل سے بیان کرنے کے بعد بھائی جان کہتے ہیں کہ میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر ذمہ دار شخص (یعنی وائس چانسلر) ایسے نازک مواقع پر پہل کرکے سامنے آجائے اور رُو در رُو بات کرے تو بہت سارے مسائل شروع ہی میں طے ہوائیں، ورنہ جب دن گزر جاتے ہیں تو پھر پرسٹیج (ناک) کی بات آجاتی ہے۔ وائس چانسلر سمجھتا ہے کہ یہ لوگ خراب ہیں۔ میں نے اتنا کچھ ان کے ساتھ کیا اور یہ میری بات نہیں مانتے۔ دوسری جانب لڑکے یا اساتذہ یا عملے کے لوگ جن سے اختلاف پیدا ہوا ہے وہ سوچتے ہیں کہ وائس چانسلر استبدادی ذہن رکھتا ہے اور اس سے بڑا ظالم کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ اس طرح اختلاف کی خلیج بڑھتی چلی جاتی ہے۔

اب ہم پھر اپنے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ تو کشمیر کی سیاست میں یہ ایک ایسا وقت تھا جب ہندوستان کی حکومت اور جے کے ایل ایف (جموں کشمیر لبریشن فرنٹ) چکّی کے دو پاٹ بنے ہوئے تھے جن کے درمیان بے قصور مسلمان خواہ وہ کشمیری ہوں یا غیر کشمیری، پس رہے تھے۔ جے کے ایل ایف کی سیاست کو سمجھنے کے لیے آپ اس کا مختصر پس منظر اپنے ذہن میں تازہ کرلیجیے۔

ابتدا میں مقبوضہ کشمیر کی مختلف مسلمان جماعتوں اور مسلم مجاہدین نے ہندوستان کے خلاف ایک مرحلہ وار ''تحریکِ جہاد'' شروع کی جو رفتہ رفتہ زور پکڑتی گئی۔ شروع شروع میں تو اس تحریک کا ذکر جہاد کے مقدس نام سے ہوتا رہا اور نہ صرف کشمیر بلکہ پاکستان کے لوگ بھی سمجھتے رہے کہ اس کا اصل مقصد پاکستان کے ساتھ جموں اور سری نگر پر مشتمل مقبوضہ کشمیر کا الحاق ہے لیکن صورتِ حال لاشعوری طور پر بدلتی گئی اور بات اسلام سے ہٹ کر کشمیر، جہاد سے ہٹ کر حریت پسندی اور الحاق سے ہٹ کر

آزادی تک آن لگی۔ ۱۸ر اپریل ۱۹۹۰ء کے روزنامہ ''جنگ'' میں عبدالقادر حسن نے اپنے کالم ''غیر سیاسی باتیں'' میں لکھا:

ہماری حکومت بھی کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق سے زیادہ اس کی آزادی کی بات کر رہی ہے اور ہمارے ذرائع ابلاغ کشمیریوں کو مجاہدین نہیں بلکہ حریت پسند کہتے ہیں۔ بھارت میں (بھی) اب بھرم رکھنے کے لیے دبے لفظوں میں یہ کہا جا رہا ہے کہ کشمیر آزاد ہوتا ہے تو ہوجائے مگر پاکستان کے ساتھ نہ ملے۔

یہاں میرا مقصد کشمیر کی پاکستانی سیاست پر اپنی رائے دینا نہیں، تاہم محض ترتیبِ واقعات کی خاطر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ''حریت پسندوں'' کی جس جماعت نے کشمیری مسلمانوں کے جہاد کا نیا قبلہ متعین کیا، یہ وہی جماعت ہے جس نے ۱۹۷۱ء میں ''گنگا'' نامی ہندوستانی ہوائی جہاز کے اغوا اور پھر لاہور کے ہوائی اڈے پر اس کے جلانے کا کارنامہ انجام دیا تھا۔ عجب اتفاق کہ جوں ہی یہ جہاز اترا، ایک اور جہاز سے ذوالفقار علی بھٹو صاحب بھی غالباً ڈھاکہ سے آکر اترے۔ واقعہ معلوم ہوتے ہی وہ تیزی کے ساتھ اغوا کنندگان کے پاس گئے اور ان کی پیٹھ تھپک کر انھیں خراجِ تحسین پیش کیا۔ لیکن اس خبر کے نشر ہونے کے آدھ گھنٹے کے اندر اندر ایک تنہا آواز بلند ہوئی تھی اور وہ آواز بوڑھے مجاہد سردار عبدالقیوم کی تھی۔ انھوں نے اس واقعے میں ہندوستانی سازش کی نشان دہی کی تھی لیکن ہماری قوم اس ''بے مثال کارنامے'' کی خوشی میں اس طرح سرشار تھی کہ یہ بوڑھی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی اور دوسرے دن ہندوستان نے اسے بہانہ بنا کر اپنی فضا سے پاکستان کے دونوں بازوؤں کا ہوائی رابطہ منقطع کردیا اور پی آئی اے کو کراچی یا لاہور سے ڈھاکا جانے کے لیے کولمبو اور چٹاگانگ کا انتہائی طویل راستہ اختیار کرنا پڑا۔

اس کے بعد سقوطِ ڈھاکا تک کا جو عرصہ گزرا اس میں ہم اسی طویل راستے سے سفر کرتے رہے اور کہنے والوں نے کہا کہ مشرقی پاکستان کی جنگ دراصل ہم اسی

دن ہار گئے تھے جب کشمیری ''حریت پسند'' ہندوستانی ''گنگا'' پاکستان لائے تھے۔ بعد میں حکومتِ پاکستان کو بھی اس سازش کا ادراک ہوگیا اور جہاز کے اغوا کنندگان جو جموں کشمیر لبریشن فرنٹ (جے کے ایل ایف) کے ارکان تھے، ہندوستانی خفیہ کے تنخواہ یافتہ ملازمین ثابت ہوئے۔ پاکستان میں انھیں سزا ہوئی لیکن سانپ نکل چکا تھا، اب لکیر پیٹنے والی بات تھی۔

الغرض وادیٔ کشمیر میں جوں جوں جہاد کی تحریک زور پکڑنے لگی اسی بلکہ اس سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ حریت پسندی نے جہاد پر غلبہ حاصل کرلیا۔ اس کا پس منظر ذہن میں واضح کرنے کے لیے یہ بھی یاد کیجیے کہ ہندوستانی اخبارات کے حوالے سے ہندوستانی وزیراعظم راجیو گاندھی کا یہ بیان چھپا کہ ارجن سنگھی گورنر جگ موہن نے مقبوضہ کشمیر میں اپنا عہدہ سنبھالنے سے پہلے راجیو سے کہا تھا کہ وہ کشمیر میں مسلم بنیاد پرست اور پاکستان سے الحاق کی خواہش مند جماعتوں کو جے کے ایل ایف کے ذریعے کچل دے گا۔ اور جگ موہن اپنی اس حکمتِ عملی میں کامیاب رہا۔

کشمیری ''حریت پسندوں'' نے بلاامتیازِ دین و مذہب بندوق کا استعمال شروع کردیا۔ ایم ایچ عسکری نے ۱۸/ اپریل ۱۹۹۰ء کے روزنامہ ''ڈان'' میں اس صورتِ حال پر یہ تبصرہ کیا:

> ایک ایسے ماحول میں جہاں کلاشن کوف، ہینڈ گرینیڈ اور ٹائم بم فیصلہ کن عناصر بن جائیں، ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کا یہ قول کہ ''ہمارے عہد کے اہم سیاسی اور نسلی سوالات کا حل عدم تشدد ہے'' نہ صرف حقائق سے بعید بلکہ یہ ایسے تصوراتی افکار معلوم ہوتے ہیں جو (اپنی روح کھو کر) مجرد شکل اختیار کرچکے ہیں۔

یہ ضمنی بات میں نے صرف اس لیے کہی تاکہ قارئین کو تمام باتیں ان کے صحیح تناظر میں سمجھنے کا موقع ملے اور ان پر یہ بات روشن ہوجائے کہ غیرضروری اور ناجائز تشدد کی راہ اپنا کر ہم اپنی منزل کو کھو تو سکتے ہیں پا نہیں سکتے۔ بہرحال اب پھر اصل

واقعے کی طرف آیئے۔ جگ موہن کی آمد کے بعد جے کے ایل ایف کی سرگرمیوں نے اتنا زور پکڑا کہ قتل و غارت گری روزمرہ کا معمول بن گئی۔ ظاہر ہے ایسے موقعوں پر نہتے عوام دل سے یا بے دلی کے ساتھ ایسی تحریکوں سے تعاون کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ جب پاکستان میں قائم مذہبی جماعتوں نے بھی جو نسبتاً گوشۂ عافیت میں تھیں، اس صورتِ حال سے خاموش تعاون کرلیا تو کشمیری عوام سے آپ کیا توقع کرتے ہیں۔ بہرحال، اسی عالم میں بدنصیب پروفیسر مشیرالحق بھی اپنے کشمیری مسلمان پرائیویٹ سیکریٹری کے ساتھ جمعہ ۶/ اپریل کو گورنر سے ملنے گئے۔ ڈرائیور کے علاوہ کار کی اگلی نشست پر ایک چپراسی فائلیں لیے ہوئے تھا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مشیرالحق سے سرکاری طور پر بہت دنوں سے یہ کہا جارہا تھا کہ وہ اپنے ساتھ سیکورٹی گارڈ رکھیں لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کردیا تھا کہ ''میرا کوئی دشمن نہیں اور میں کسی لحاظ سے سیاسی آدمی نہیں ہوں۔ میرا کام صرف بچوں کو پڑھانا ہے۔ میں اپنی شخصیت کو کسی لحاظ سے متنازعہ بنانا نہیں چاہتا۔ یوں بھی مجھے کسی سیکورٹی گارڈ پر نہیں صرف اللہ کی ذات پر بھروسا ہے۔ اگر اسے میری موت منظور ہے تو کوئی مجھے بچا نہیں سکتا۔''

گورنر سے بھائی جان کی کیا بات ہوئی اس کا خود ہندوستان میں ہمارے گھر والوں کو علم نہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ دیگر انتظامی امور کے علاوہ وہاں ان کی ملازمت میں دو سال کی توسیع کا معاملہ بھی زیرِ بحث آیا ہوگا جس کی پیش کش انھیں بہت دنوں سے کی جارہی تھی لیکن وہ اس سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کرپائے تھے۔ ایک طرف کشمیری مسلمانوں کی تعلیمی حالت کو استوار رکھنے کے جذبے کے ساتھ ساتھ خود اپنے کیریئر کو جاری رکھنے کا سوال تھا جو انھیں اس پیش کش کو قبول کرنے پر اکسا رہا تھا تو دوسری طرف وہ کشمیر کی بدلتی ہوئی صورتِ حال کی وجہ سے وہاں اپنے قیام کو غیرمفید اور نامناسب سمجھنے لگے تھے۔ غالباً ان کا رجحان واپس جانے کی طرف زیادہ ہوچکا تھا۔ چناں چہ گورنر ہاؤس جاتے ہوئے اپنے فیصلے کا سرسری تذکرہ انھوں نے اپنی اہلیہ (اب مرحومہ) سے بھی کردیا تھا۔

جگ موہن سے گفتگو کرنے کے بعد پروفیسر مشیرالحق یونی ورسٹی اپنے دفتر میں واپس آئے، فائلیں رکھیں اور گھر کی طرف روانہ ہوئے تاکہ وہاں سے کپڑے وغیرہ بدل کر حضرت بل کی جامع مسجد میں جمعے کی نماز ادا کرنے جائیں۔ جہاں وہ ہمیشہ جمعے کی نماز ادا کرتے تھے۔ گھر کے قریب اسپیڈ بریکر پر ہتھیار سے مسلح چھ آدمیوں نے گاڑی روکی۔ ڈرائیور اور چپراسی کو اتار دیا اور ان کے بیان کے مطابق پرائیویٹ سیکریٹری عبدالغنی زرگر کو بھی چلے جانے کی پیش کش کی لیکن انھوں نے اسے جذبۂ وفاداری و محبت کے خلاف سمجھا اور کہا کہ ''جہاں میرے صاحب جائیں گے، میں بھی جاؤں گا۔'' اس طرح یہ دو آدمی اغوا ہوگئے۔

جمعے کی شام کو بی بی سی اور دوسرے ریڈیو اسٹیشنوں نے اس اغوا کی خبر دی۔ ہم لوگوں نے فوراً ہی دہلی ٹیلی فون کیا جہاں اس وقت ان کی بیٹیاں اور ایک داماد موجود تھے۔ لڑکیوں کی پریشانی فطری تھی لیکن انھیں قدرے اطمینان بھی تھا کیوں کہ اس سے پہلے ہندوستان کے وزیرِ داخلہ مفتی سعید (کشمیری) کی بیٹی اور ایک ہندو پولیس افسر کے بیٹے کے اغوا اور پھر ان کی رہائی کے واقعات لڑکیوں کے ذہنوں میں تازہ تھے۔

بہرحال حقیقت یہ ہے کہ بھائی جان اور ان کے پرائیویٹ سیکریٹری کی رہائی میں کشمیری حکومت اور ہندوستانی فوج کا رویّہ شروع سے آخر تک عدم دلچسپی کا مظہر رہا۔ جب بھائی جان کی لاش دہلی لائی گئی تو آخری مرحلے تک کا آنکھوں دیکھا حال روزنامہ ''قومی آواز'' دہلی میں مفصل شائع ہوا جس کے جستہ جستہ اقتباسات سے آپ کو وہاں ہزاروں ہندوستانی مسلمانوں کا ردّعمل سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ اس اخبار نے لکھا ہے کہ:

> پروفیسر مشیرالحق کے جنازے میں جتنا بڑا ہجوم تھا، اتنا ہجوم اس سے پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے جنازے میں دیکھا گیا تھا...
> آج جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بچے بچے کی زبان پر یہ سوال تھا کہ جو حکومتِ پنجاب کے ایک پولیس آفیسر کے بیٹے اور پھر مرکزی وزیرِ داخلہ کی ایک بیٹی کی رہائی کے لیے کئی کئی خوں خوار دہشت گردوں

کی رہائی پر آمادہ ہوسکتی ہے وہ پروفیسر مشیر الحق جیسی مایۂ ناز علمی شخصیت... کی رہائی کے لیے ایک معمولی انتہا پسند کو رہا کرنے پر آمادہ کیوں نہ ہوئی...

...ان کی چھوٹی لڑکی عرشی منیر نے زار و قطار روتے ہوئے چلا کر کہنا شروع کیا کہ حکومت میرے باپ کی قاتل ہے۔ اس نے کہا کہ ...میرے باپ کے قتل میں حکومت کی سازش ہے...

... پروفیسر مشیر الحق کے داماد لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبہ عربی میں ریڈر شاہ عبدالسلام نے غصے اور جذبات سے بھرے لہجے میں کہا کہ مشیر صاحب کے قتل کے لیے جتنا دہشت گرد ذمہ دار ہیں اتنا ہی مفتی سعید، جارج فرنانڈس اور جگ موہن بھی۔

...سری نگر سے ہمارے نمائندے کی رپورٹ کے مطابق نام نہاد جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ کے چیئرمین مسٹر امان اللہ خاں کے اشارے پر پاکستانی حمایت یافتہ جنونی انتہا پسندوں نے پروفیسر مشیرالحق اور ان کے سکریٹری کو گولیوں سے چھلنی کرکے ان کی لاشوں کو پھینک دیا اور اس خونِ ناحق پر اپنی مسرت اور کامیابی کا اعلان کرنے کے لیے ان سر پھرے انتہا پسندوں نے کئی گولیاں چلائیں۔

...زیادہ تر لوگوں کا کہنا تھا کہ حکومت نے بھارتیہ جنتا پارٹی کے دباؤ میں آکر پروفیسر مشیر الحق کی جان کا سودا کرلیا ۔

میرا تاثر یہ ہے کہ یہ کھیل اس لیے کھیلا گیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں کشمیری مجاہدین کے لیے محبت اور اخوت کے کچھ جذبات اگر خفتہ شکل میں بھی ہوں تو انھیں ختم کردیا جائے اور انھیں ختم کرنے کی اس سے بہتر صورت اور کیا ہوگی کہ مذہب کی بنیاد پر چلنے والی تحریک کو علاقائیت کا رنگ دے دیا جائے۔ آخرکار عدم دلچسپی

یا ''اصل دلچسپی'' کے اس ماحول میں دو مسلمانوں کو قتل کر دیا گیا۔

اب پاکستان کے مسلمانوں کا ردِّعمل ملاحظہ کیجیے۔ پہلی بات تو یہ کہ یہاں سب سے پہلے پھر وہی بوڑھی آواز بلند ہوئی یعنی بھائی جان کے انتقال سے دو روز پہلے صدر آزاد کشمیر سردار عبدالقیوم نے اپیل کی جو ''نوائے وقت'' میں شائع ہوئی۔ سردار صاحب نے کہا کہ ''پروفیسر مشیر الحق ایک معروف دین دار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ فوج، پولیس یا کسی ایسے انتظامی محکمے سے تعلق نہیں رکھتے جنھوں نے کشمیریوں پر ظلم و جبر کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اتنی مقتدر اور مہذب شخصیت کو اغوا کر کے لے جانا نیک نامی کا باعث نہیں ہوسکتا۔ اگر مغوی کو کوئی نقصان پہنچا تو اس سے تحریکِ آزادی کی بڑی بدنامی ہوگی۔''

ریکارڈ کو مکمل رکھنے کی خاطر یہ بیان کرنا بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ سانحہ پیش آیا تو میں نے پاکستان میں چند عمائدین سے گفتگو کی تاکہ وہ لوگ بیان دے کر بھائی جان کی رہائی کے لیے اخلاقی مدد فراہم کریں۔ اس کوشش میں مجھے دو قسم کے ردِعمل سے سابقہ پڑا۔ میں نے ایک صاحب (اب مرحوم) سے جن کا تعلق یوپی سے تھا اور جو ایک بین الاقوامی اسلامی تنظیم کے باتنخواہ اور مراعات یافتہ عہدے دار تھے، پروفیسر مشیر الحق سے اپنا رشتہ بتانے کے بعد یہ درخواست کی کہ وہ اس سلسلے میں جو کچھ کر سکتے ہوں، کریں۔ انھوں نے انسانی بنیاد پر بھی میرے برادرانہ جذبات کا کچھ خیال نہ کیا اور بڑی بے رُخی اور بے نیازی کے ساتھ انتہائی اذیت ناک لہجے میں مجھ سے کہا، ''ٹھیک ہے، جب تحریکیں چلتی ہیں تو کچھ نہ کچھ قربانیاں تو دینی ہی پڑتی ہیں۔'' بہرحال میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان صاحب کی مغفرت فرمائے۔

دوسرا ردِعمل مولانا ظفر احمد انصاری مرحوم کا تھا جو ان دنوں کراچی میں اپنی زندگی کی آخری بیماری سے گزر رہے تھے۔ انھوں نے نہ صرف ٹیلی فون پر اپنی نقیہہ آواز میں مجھے ڈھارس دلائی بلکہ اسلام آباد ٹیلی فون کر کے اپنے صاحب زادے ڈاکٹر ظفر الحق انصاری صاحب کو حکم دیا کہ وہ ان کی طرف سے سردار عبدالقیوم صاحب سے

بات کریں۔ ظفر اسحاق صاحب نے جو خود بھی میک گل میں بھائی جان کے ساتھی رہ چکے تھے، اپنے والد کے حکم کی تعمیل کی۔ مجھے صحیح طور پر نہیں معلوم کہ سردار صاحب نے اپنا بیان مولانا انصاری مرحوم کا پیغام ملنے کے بعد دیا یا وہ یہ بیان پہلے ہی جاری کرچکے تھے۔ بہرحال پیغام اور بیان میں تقدیم اور تاخیر سے قطع نظر ''گنگا'' والا سردار صاحب کا بیان بھائی جان کے معاملے میں بھی ان کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔

بہرحال سردار عبدالقیوم صاحب کی اپیل بھی رائیگاں گئی اور ہونی ہوکر رہی۔ فوری طور پر دو مضامین میری نظر سے گزرے۔ ایک جسارت میں احمد حاطب صدیقی (ابونثر) کا مضمون اور دوسرے ''ڈان'' میں عسکری صاحب کا مضمون جس کا ایک اقتباس اوپر دیا جاچکا ہے۔ اس مضمون کا ایک حصہ اور پڑھ لیجیے۔

> ... اگر ایک طرف ہندوستانی حکمرانوں کو مرحوم وائس چانسلر کی بے وقت موت کے سلسلے میں اپنے حصے کی ذمہ داری قبول کرنی چاہیے تو دوسری جانب یونی ورسٹی کی ایک ایسی شخصیت پر تشدد جو ایسے حالات میں بے گناہ طور پر پھنس گئی جن کے پیدا کرنے میں ان کا اپنا کوئی ہاتھ نہ تھا، نہ صرف وجہ تاسّف بلکہ ایک لمحۂ فکریہ بھی مہیا کرتا ہے۔ افسوس اس بات کا کہ مشیر الحق نے اپنی زندگی تعلیم و تعلّم کے لیے وقف کردی (اور پھر یہ انجام) اور لمحۂ فکریہ اس بات کے لیے کہ وہ لوگ جو شدید ناانصافی کے احساس کے تحت اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، وہ اتنی عجلت میں ہیں کہ اپنے افعال کے نتائج اور عواقب پر غور کرنے کی انھیں فرصت نہیں۔

اس کے برعکس بعض ردّعمل منفی اور دردناک بھی تھے۔ بعض اخبارات اور چند ایک دانش وروں نے بے بنیاد اور قیاسی الزامات لگائے اور تعریضیں بھی کیں لیکن اب وقت اتنا گزر چکا ہے کہ اس پورے واقعے پر خاک ڈال دینا ہی بہتر ہے۔

علمی اعتبار سے بھائی جان کے ساتھ ایک مسئلہ یہ تھا کہ چند مسائل میں جن

سے جدید دنیا کے مسلمانوں کو دن رات دو چار ہونا پڑتا ہے، بھائی جان کے افکار بعض یا اکثر قدیم الخیال علما کے افکار سے مختلف تھے۔ بعض موضوعات پر لوگوں سے ان کی گفتگو اور خط و کتابت بھی ہوئی۔ میاں بیوی کی علاحدگی کے بعد بیوی کے نفقے کے سلسلے میں ہندوستان میں مشہور مقدمہ ''شاہ بانو کیس'' میں سپریم کورٹ آف انڈیا کے فیصلے پر بھائی جان کی رائے کلیتاً وہ نہ تھی جو دیگر علما کی تھی۔ اور نہ کلیتاً وہ تھی جو سپریم کورٹ آف انڈیا کی تھی۔ ان کے اس رویے کو بعض لوگوں نے ان کی میک گل (کناڈا) میں پروفیسر کینٹویل اسمتھ اور پروفیسر چارلس ایڈمس کی تعلیم کی طرف منسوب کیا جو ممکن ہے کسی حد تک صحیح ہو۔ بھائی جان کے معترضین میں سب سے مؤثر شخصیت ان کے استاد مولانا ابوالحسن علی ندوی اور ان کے سینئر ساتھی اور زمانۂ طالب علمی میں ان کے سرپرست مولانا مجیب اللہ ندوی (سابق رفیق دارالمصنفین و حال ناظم جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ اور مدیر ماہ نامہ ''الرشاد'') کی تھی۔ لیکن ان دونوں نے اور بھائی جان کے ندوے کے چند دوسرے سینئر ساتھیوں نے ان کی آرا کے بارے میں جو رائے ظاہر کی انھیں آپ انھیں حضرات کی زبانی سنیے جو ڈاکٹر عبدالسلام کی ''ڈاکٹر مشیر الحق: شخصیت اور فکری بصیرت'' نامی کتاب میں درج ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی (اب مرحوم)

(بھائی جان کو اغوا کنندگان سے چھٹکارا دلانے کے لیے وزیراعظم ہند، وی پی سنگھ سے اپنی گفتگو وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد مولانا لکھتے ہیں)

> ...پروفیسر اسمتھ سے خاص تلمذ تھا، اس لیے ان کے خیالات میں کچھ ''ترقی پسندی'' کی بو آگئی تھی جس سے ہمارا دینی حلقہ اتفاق نہیں کرتا لیکن انھوں نے ہمیشہ دین اور اپنے اساتذہ اور بڑوں کا ادب و احترام ملحوظ رکھا اور تواضع و شرافت کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ وہ جب ملتے تھے یا کسی سیمینار وغیرہ میں

شریک ہوتے تھے تو وہ علمی ندوی خاندان کے ایک مؤدّب فرد اور ایک مہذب و ادب شناس شریکِ محفل نظر آتے تھے۔ آخر میں ان کو وہ علمی اعزاز (انڈین پریسیڈنٹ ایوارڈ) حاصل ہوا جو بہت ممتاز لوگوں کو بڑی منزلیں طے کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے لیکن اس اعزاز سے بڑھ کر ان کو شہادت کا اعزاز و افتخار حاصل ہوا جس سے بڑا درجہ و سعادت ایک مسلمان کے لیے نہیں ہوسکتا مگر اس سے ایک افسوس ناک اور قابلِ تشویش و ملامت نظیر و روایت قائم ہوئی جس کے لیے کوئی اخلاقی جواز اور عذر نہیں ہوسکتا...

مولانا محمد مجیب اللہ ندوی

غرض یہ کہ عزیزی مشیر الحق کے ایمان اور عقیدے میں تو کوئی خرابی نہیں تھی اور وہ نماز و روزہ کے پابند بھی تھے مگر ان کے اندر مسائل کی تعبیر میں آزادی آگئی تھی...

ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی (بھائی جان کے ایک سینئر ساتھی) استاد ندوۃ العلما

...عقائد کے لحاظ سے کسی خاص گوشے کی طرف ان (مشیر الحق صاحب) کا رجحان نہیں تھا۔ ایک سیدھے سادے قصباتی مسلمان کی طرح اسلامی عقائد رکھتے تھے۔ سیکولرازم وغیرہ تو ایک سیاسی رجحان ہے اور فیشن بھی ہے۔ میں نے ان کو ہمیشہ نماز روزے کا پابند دیکھا۔ سچا، کھرا، مخلص، دوست نواز، محسن طبع انسان تھا۔ اللہ تعالیٰ کی نوازشِ بے پایاں نے ان کو شہادت کا درجہ دیا...

پروفیسر آلِ احمد سرور، علی گڑھ

مشیر الحق ایک اچھے مسلمان، ایک اچھے انسان اور سچے محب

وطن تھے۔ وہ مسلمانوں کی امتیازی خصوصیات اور شناخت کو باقی رکھنا چاہتے تھے... وہ ایک روشن خیال اور بالغ نظر مصنف تھے۔ کٹر پن سے کوسوں دور...

پروفیسر نثار احمد فاروقی، صدر شعبۂ عربی، دہلی یونی ورسٹی

پروفیسر مشیر الحق شہید ان پر اللہ کی رحمتیں ہوں... بے گناہ شہید ہوئے۔ روزے کی حالت میں، رمضان کے مہینے میں... ان کا علم بہت راسخ تھا مگر وہ اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ ہر موضوع پر ان کی گفتگو نپی تلی ہوتی تھی۔ گفتگو میں کبھی جذباتی نہ ہوتے... پروفیسر مشیر الحق شہید ہوگئے، خوش بختی تھی، ایک نہ ایک دن جانا سب کو ہے مگر اس میں جس بات نے سب کو دکھی کیا وہ حکومت کی شقاوت اور بے رحمی تھی کہ اس نے ایک وزیر کی لڑکی اور ایک پولیس والے کے بیٹے کو یرغمالیوں سے آزاد کرانے کے لیے ان کی شرائط قبول کیں مگر ایک اہلِ علم، اسکالر اور یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کی زندگی کی کوئی فکر نہ کی۔ اس سے اندازہ ہوگیا کہ اس ملک میں ڈوم ڈھاریوں کی، نچنیوں کی، گوّیوں کی، کھیل کود میں حصہ لینے والوں کی، سیاسی لوگوں کے رشتے داروں کی، بھانڈوں اور ایکٹروں کی قدر و منزلت ہے۔ ایک اداکار کی بیماری کا حال ہفتوں تک ٹی وی اور ریڈیو سے نشر ہوتا رہا... اس ملک میں ایک اسکالر قومی زندگی کا حصہ نہیں بن سکتا۔ اسے دوسرے ہی دھندے اپنانے ہوں گے۔

پروفیسر مشیر الحق کے اس واقعۂ شہادت میں ہمارے غور کرنے کے لیے بہت سے نکتے ہیں اور بہت سے سبق ہیں۔ کاش ہم انھیں سمجھ سکیں...

مولوی ضیاء الدین اصلاحی، ناظم دارالمصنفین، اعظم گڑھ

(تقریباً تیرہ صفحات میں بھائی جان کی پانچ کتابوں پر تبصرہ کیا ہے)

''مسلمان اور سیکولر ہندوستان'' کے بارے میں اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:

> فاضل مصنف نے مسائل کا تجزیہ غیرجانب داری کے ساتھ کیا ہے اور ہر طبقۂ خیال کے نقطۂ نظر کی بے کم و کاست ترجمانی کی ہے۔ ان کے اس معروضی تبصرے و تجزیے سے خود ان کے جو رجحانات و نتائج سامنے آتے ہیں، ان سے مسلمانوں کی اکثریت کا جن میں ہر طبقہ و مسلک کے مذہبی افراد شامل ہیں، اتفاق نہیں ہوسکتا۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتاب بڑے غور و فکر اور گہرے مطالعے کے بعد لکھی گئی ہے۔ ان کے خیالات میں بڑی حد تک اعتدال و توازن موجود ہے...

پروفیسر اختر الواسع، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

(جن مسائل میں بھائی جان کا علمی رویّہ اختلاف کا تھا، ان پر عملاً ان کا کردار کیسا تھا، اس کا اظہار ان کے ایک شاگرد پروفیسر اختر الواسع کے اس بیان سے ہوگا:

> مشیر صاحب مذہبی معاملات میں بعض اوقات ایسی رایوں کا اظہار بھی کردیتے تھے جنھیں ہمارا روایت پسند معاشرہ آسانی سے قبول نہیں کرتا لیکن حق یہ ہے کہ مشیر صاحب ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے... غالباً ۱۹۷۸ء میں حکومتِ ہند کی مرکزی وزارتِ دفاع سے ان کے پاس ایک خط آیا جس میں ان سے دو امور پر رائے مانگی گئی تھی۔ پہلی تو یہ کہ کیا مسلمانوں کے لیے مشینی ذبیحہ قطعاً جائز نہیں اور دوسری یہ کہ کیا داڑھی رکھنا ہر مسلمان کے لیے لازمی ہے۔ جب یہ خط میری نظر سے گزرا تو مجھے یقین تھا کہ

مشیر صاحب کی رائے کیا ہوگی؟ کیوں کہ مشینی ذبیحے کے بارے میں وہ ایک مضمون دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ کی ایک علمی مجلس میں پڑھ چکے تھے جو بعد میں رسالہ ''جامعہ'' دہلی میں شائع بھی ہوا۔ جہاں تک داڑھی کا سوال تھا تو خود ان کے داڑھی نہیں تھی۔ چند دن کے بعد میں نے ان کی میز پر وہ خط پھر دیکھا تو پوچھ لیا کہ کیا آپ نے اس کا جواب دے دیا۔ کہنے لگے کہ ہاں آج ہی جواب تیار ہوا ہے اور انگریزی میں ٹائپ کیا ہوا جو خاصا تفصیلی تھا، مجھے پڑھنے کو دیا۔ جب میں نے اسے پڑھا تو بہت تعجب ہوا کیوں کہ وہ میری توقع کے بالکل برعکس تھا۔ مشیر صاحب نے میری حالت کو بھانپ لیا اور کہا کہ کیا بات ہے۔ کیا تمھیں جواب پسند نہیں آیا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا کہ نہیں ایسی بات نہیں۔ آپ نے ندوہ میں تو مشینی ذبیحے کے جواز کے بارے میں مضمون پڑھا تھا اور داڑھی آپ خود نہیں رکھتے لیکن آپ نے اس میں مشینی ذبیحے کے خلاف رائے دی ہے اور داڑھی کے جواز کو ثابت کیا ہے۔ انھوں نے کہا، میری انفرادی رائے اور انفرادی عمل اس وقت تک حجت نہیں بن سکتا جب تک علمائے دین کا اس پر اجماع نہ ہوجائے۔ میں نے ندوہ میں مضمون علمائے امت کی مجلس میں اس لیے پیش کیا کہ وہ اس نئے مسئلے پر غور و خوض کریں اور داڑھی نہ رکھنا میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ تم یہ سوچو کہ یہ سوال نامہ میرے پاس کیوں آیا؟ اس لیے آیا کہ کچھ سرکاری ملازموں یا مسلمان فوجیوں نے مشینی ذبیحہ کی مخالفت کی ہوگی اور داڑھی رکھنی چاہی ہوگی اور اس باب میں شریعت کے موجودہ احکامات کا حوالہ دیا ہوگا۔ اس لیے میں اپنی انفرادی رائے یا عمل

کو بنیاد بنا کر اگر کوئی رائے دوں تو یہ سراسر غلط بات ہوگی...
علم و فضل کے بعد اب بھائی جان کے انسانی کردار کے بارے میں کچھ بڑے لوگوں کی آرا ملاحظہ ہوں۔

ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ

...اپنی وائس چانسلری کے زمانے میں... وہ ندوہ آئے تو اپنے پرانے ساتھیوں سے بھی ملے... جب اپنی رہائش گاہ پر قریب سے دیکھا تو مزاج و افتاد، چال ڈھال، گفتگو اور بے تکلفی میں کہیں سے وہ ''آنریبل'' نہیں دکھائی دیے۔ یہی اخلاقی جوہر ہے جو ان کا امتیازی وصف تھا... ان کی اخلاقی بلندی یہ بھی بتاتی ہے کہ وہ ایک اونچے، شریف گھرانے کے شریف انسان تھے...

پروفیسر آل احمد سرور، سرسیّد نگر، علی گڑھ

مشیرالحق مرحوم کا کشمیر کی سیاست سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ کشمیر کی علمی خدمت کے لیے وہاں گئے تھے۔ وہ ایک معلم اور مصنف ایک دانش ور اور ذہنی معمار تھے۔ فرشتہ صفت آدمی تھے۔ جس کی جو مدد ہو سکتی تھی اس کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے... مذہب میں عقیدے اور عبادت کے علاوہ حسنِ معاملات پر بھی وہ بہت زور دیتے تھے...

پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی، سابق صدر شعبۂ عربی، کشمیر یونی ورسٹی

...مشیرالحق صاحب سادہ مزاج اور سادگی پسند تھے۔ ایک مرتبہ خود انھوں نے مجھ سے کہا کہ فلاں صاحب (جنھیں مشورہ دینے کا بہت شوق تھا) نے رائے دی کہ آپ شیروانی پر شال نہ ڈالا کریں

یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے لیکن میں نے انھیں جواب دیا کہ میں لوگوں کو اچھا معلوم ہونے کی خاطر کشمیر کی سردی برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوں...

پروفیسر ابوالکلام قاسمی، شعبۂ اردو، علی گڑھ یونی ورسٹی

پروفیسر مشیر الحق کی سرشت میں انکسار اور عدم ادعائیت کا انداز ابتدا ہی سے شامل تھا... انھوں نے اپنی زندگی کے لیے کبھی دوہرے معیار نہیں بنائے...

پروفیسر محمد اجتبا ندوی، شعبۂ عربی، الٰہ آباد یونی ورسٹی، سابق پروفیسر و صدر شعبۂ عربی، کشمیر یونی ورسٹی

...شعبوں کی تدریس ،کارکردگی کی نگرانی، اجتماع، میٹنگ اور کمیٹیوں کی صدارت کرتے تھے اور خوش اخلاقی، خوش مزاجی، تواضع و انکسار ہمہ وقت اور ہر جگہ نمایاں و کارفرما رہتا... ایک بار کسی ورکشاپ کا افتتاح تھا۔ سردی بہت تھی... مشیر صاحب کا افتتاحی خطبہ بغیر کسی لطیفے یا پرلطف جملے کے پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ جلسے کے بعد سائنس کے ڈین اور فزکس کے سینیئر پروفیسر جناب کھیرا صاحب نے کہا کہ وائس چانسلر صاحب آج تو ٹھنڈک نے اپنا اثر دکھلا دیا۔ آپ اگر کوئی لطیفہ سنا دیتے تو ہمیشہ کی طرح رگ و پے میں گرمی اور مسرت کی لہر دوڑ جاتی۔ اتفاق سے دوسرے دن بھی کسی سیمینار کا افتتاح تھا۔ مشیر صاحب نے پروفیسر کھیرا صاحب کے حوالے سے فرمایا کہ آج میں دو لطیفے سناؤں گا...
یونی ورسٹی ہوسٹل کے طالب علموں نے تعلیمی سال کا اختتامی جلسہ منعقد کیا۔ وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحق صاحب کو مہمان خصوصی

بنایا۔ جب ان کی تقریر کی باری آئی تو بڑی دلچسپ تقریر کی۔ اپنے لطیفوں اور چٹکلوں سے جلسے کو زعفران زار بنا دیا۔ یونی ورسٹی کیمپس میں کئی روز تک اس کا چرچا رہا...

پروفیسر شمیم حنفی، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

...مشرقی یو پی کے قصبات کا ایک اپنا مزاج ہے۔ بہت نرم رو بہت متین اور بہت سادہ۔ ان قصبوں میں تہذیب اور اقدار کی نگہبانی اور پرورش جس توجہ اور تسلسل کے ساتھ ہوئی، اس پر اتنی ہی خاموشی کا پردہ بھی پڑا ہوا ہے۔ قصباتی شرفا میں اپنے امتیازات اور اپنی کامرانیوں پر کسی طرح کی نخوت تو دور کی رہی ان کے ذکر پر شرما جانے کی عادت اور ادعا عام ہے... مشیر صاحب کا خمیر بھی ایسے ہی ایک قصبے کی خاک سے اٹھا تھا... ایسے بزرگوں سے بھی نیازمندی کا رشتہ انھوں نے ہمیشہ استوار رکھا جن سے وہ نظریاتی اختلاف رکھتے تھے اور یہ بزرگ بھی مشیر صاحب کے مقدمات سے خواہ قائل نہ ہوئے ہوں لیکن پھر بھی مشیر صاحب کی نیک نفسی، شرافت اور حق گوئی کے ہر موقعے پر معترف رہے...

پروفیسر شعیب اعظمی، شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

پروفیسر مشیر الحق صحیح معنوں میں مردِ مومن تھے۔ وہ اصول پسند، صاف گو اور جری تھے اور اسی لیے اپنے مؤقف پر قائم رہنا جانتے تھے۔ وہ قلم اور زبان دونوں کے دھنی اور یکساں تھے۔ جو بات کہتے دل سے مختلف نہ ہوتی اور جو لکھتے اس کے مطابق ہوتا۔ ان کے مزاج میں جہاں ان کی والدہ مرحومہ کی نرم خوئی اور شفقت تھی، وہیں اپنے والد مرحوم کی پیشہ ورانہ شدت اور سختی بھی تھی...

پروفیسر محمد راشد ندوی، شعبۂ عربی، علی گڑھ یونی ورسٹی

مشیر صاحب دل سے چاہتے تھے کہ ہندوستانی مسلمان اس وقت کے تعلیمی مسائل میں، جو غیرضروری بحثیں چل رہی ہیں، ان میں الجھنے کے بجائے ہر طرح کی تعلیم حاصل کریں اور اپنی قوم و ملت کے لیے مفید ثابت ہوں... اگر وہ کسی مسئلے میں مخالفت بھی کرتے تو ان کی مخالفت کا انداز بھی بڑا پیارا اور نرالا ہوتا تھا...

پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

... اکثر دیکھا گیا ہے کہ کم ظرف لوگ معمولی عہدہ پاتے ہی ہفت افلاک کی سیر کرنے لگ جاتے ہیں اور آسمان سے کبھی زمین پر نہیں اترتے۔ مشیر صاحب کے قدم ہمیشہ زمین پر رہے اور نگاہیں پاؤں پر رہیں۔ نہ ان کی گردن اکڑی، نہ چال میں فرق آیا، نہ آواز میں کڑک اور جھنکار پیدا ہوئی۔ وہ ویسے ہی ہنستے مسکراتے اور دل نچھاور کرنے والے مشیر صاحب رہے...

پروفیسر محمد سالم قدوائی، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

(فرزندِ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی)

کشمیر یونی ورسٹی میں اساتذہ کو بڑے پیمانے پر پروموشن اسکیم کا فائدہ پہنچایا۔ طلبہ اور اساتذہ ہر ایک کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا، اسٹاف کے لیے بہت سے مکانات بنوائے۔ مختلف قسم کے تعلیمی منصوبے بنائے۔ اسٹاف میں کشمیر کے لوگوں کا خاص طور سے خیال رکھا لیکن اس کے بدلے میں انھیں کیا ملا، وحشت، بربریت اور بہیمانہ قتل...

پروفیسر اختر الواسع، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

... وائس چانسلر ہونے کے بعد جب وہ دہلی آتے تو بجائے کشمیر ہاؤس میں قیام کے جامعہ میں اپنے گھر پر ہی ٹھہرتے اور یہاں سب کے گھر جانے کے لیے ہمیشہ کی طرح سائیکل کا ہی استعمال کرتے۔ ہم میں سے کئی لوگوں نے کہا بھی کہ اب آپ کے لیے سائیکل پر چلنا مناسب نہیں تو مسکرا کر ٹال جاتے اور کہتے کہ بھئی اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جب وہ کسی طرح سائیکل پر چلنے سے نہ رُکے تو پھر ایک دن ان سے کہا گیا کہ آپ کو تو یقیناً کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن آپ بھی تو خیال کیجیے کہ اس کیمپس میں ایک اور وائس چانسلر بھی مقیم ہیں۔ آپ کا یہ عمل ان کے لیے نزاکتیں پیدا کرسکتا ہے اور اس طرح ان کا سائیکل سے چلنا بند ہوا...

(اس جگہ یہ بیان کرنا غالباً خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ بھائی جان کے انتقال پر ان کے استاد اور عالمِ اسلام کے مشہور عالم مولانا ابوالحسن علی ندوی تعزیت کرنے لکھنؤ سے دہلی آئے تو ان کا گھر دیکھ کر بولے کہ یہ کسی وائس چانسلر کا بنگلا ہے یا کسی فقیر کی کٹیا؟) (محی الحق)

ڈاکٹر زبیر احمد فاروقی، شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، یونی ورسٹی، دہلی

... وہ کشمیر سے جب بھی آتے، تمام جاننے والوں کے گھروں پر جاکر ان سے ملنا ان کے معمول میں شامل تھا۔ اگر ہم میں سے کوئی کسی کام سے کشمیر جاتا اور ان کو معلوم ہوجاتا تو اس کی ہر طرح سے خبرگیری کرنے پر ان کو بہت خوشی محسوس ہوتی تھی... کام کرنے کا ان کا اپنا ایک خاص انداز تھا۔ وہ بڑے سے بڑے اور مشکل سے مشکل کام کو نہایت صبر و سکون اور سلیقے سے کرنے کے عادی تھے...

سیّد ضیاءِ الحسن ندوی، صدر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

کشمیر یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالنے کے بعد پہلی بار اپنے گھر جامعہ نگر آئے اور اپنی ایک بیٹی نیز دوسرے چھوٹے بڑے ساتھیوں سے ملنے جانے کے لیے جب انھوں نے اپنی پرانی سائیکل اٹھائی تو لوگوں نے اصرار کیا کہ جامعہ سے گاڑی یا ٹیکسی منگالیں۔ جامعہ کے اس وقت کے وائس چانسلر پروفیسر علی اشرف یہ پیش کش بھی کر چکے تھے کہ اپنی ضرورت کے لیے وہ جامعہ کی کار استعمال کر سکتے ہیں لیکن تمام پیش کشوں اور محبت و اصرار کا جواب موصوف نے یہ دیا کہ خدا کا شکر ہے کہ نئے منصب نے مجھے ہاتھ پیر سے معذور اور اپاہج نہیں بنایا ہے۔ کچھ اسی جیسا جواب ان کے پرائیویٹ سیکریٹری اور ان کے ڈرائیور کو بھی ملا تھا جب وی سی لاج سے وی سی آفس پہنچنے پر ڈرائیور اور سیکریٹری کے اترنے سے پہلے ہی خود کار کا دروازہ کھول کر وہ دفتر کی طرف بڑھنے لگے اور ان دونوں نے دست بستہ التجا کی کہ اس درجہ انکساری منصب کے شایانِ شان نہیں۔ کار یا دفتر کا دروازہ کھولنا ہماری ڈیوٹی ہے۔ مشیر صاحب نے فرمایا کہ ایسا منصب ایک صحت مند ہاتھ پیر اور اس سے بڑھ کر ایک صحت مند انسانی عقل رکھنے والے بندے کے شایانِ شان نہیں ہوسکتا...

ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی، استاذ، جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، دہلی

... لاش جب کشمیر سے دہلی جامعہ ملیہ لائی گئی تو کہرام مچ گیا اور جب جنازہ اٹھا تو اتنے آدمی تھے جتنے کسی اور کے جنازے پر یہاں نہیں دیکھے گئے۔ پورا شہر اُمڈ آیا۔ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا

سمندر، رات کا وقت، قدم قدم پر پیٹرومیکس کا انتظام، ایسا لگتا تھا جیسے شاہی برات ہو۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو سچ مچ حجلۂ عروسی بنا دے...

بھائی جان کے علمی اور ادبی مقام، خاندانی روایات اور ذاتی کردار کے سلسلے میں یہ سارے اقتباسات ''حدیثِ دیگراں'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب ایک دلچسپ، ذاتی واقعے پر ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

ایک بار جب بھائی جان ہم لوگوں سے ملنے پاکستان آئے تھے تو میری ایک سالی کی خوردسال بچی نے بھائی جان کے چہرے میں پرنس چارلس کی شباہت دریافت کرلی جس کی تائید اس کی خالہ زاد بہنوں یعنی میری بچیوں کے علاوہ خاندان کی دوسری ہم عمر لڑکیوں نے بھی کردی۔ بہت دنوں تک اور خاص طور پر جب بھی بھائی جان پاکستان آتے، اس تحقیق کا لطف لیا جاتا اور میں ان کے سامنے اپنی بچیوں سے گلہ کرتا کہ اتنے دنوں تک ساتھ رہنے کے باوجود تم لوگوں نے مجھ میں کسی شہزادے کیا کسی بھی بڑے آدمی کی شباہت نہ تلاش کی اور بھائی جان کے چند دنوں کے قیام میں تم لوگوں نے اپنے بڑے ابا میں پرنس چارلس کو ڈھونڈ نکالا۔ خیر یہ تو ایک مذاق تھا لیکن یہ ایک حقیقت تھی کہ بھائی جان کے چہرے پر ایک عجیب وقار، بھولا پن اور معصومیت تھی اور ان خداداد خوبیوں کی وجہ سے ان کے ملنے والے انھیں بڑی محبت اور احترام سے دیکھتے۔

پاکستان آنے کے بعد پہلی بار ۱۹۷۸ء میں تین مہینوں کے لیے میں ہندوستان گیا۔ ان دنوں ہماری والدہ زندہ تھیں۔ تقریباً دو مہینے میں بھائی جان کے ساتھ دہلی میں رہا اور ایک مہینے سے کچھ کم ہم دونوں بھائی لکھنؤ، بحری آباد اور اعظم گڑھ کی سیر کرتے رہے۔ اس دوران میں تین ماہ کی طویل مدت تک ہم دونوں بھائیوں کا روز و شب کا ساتھ رہا اور جوں جوں میں انھیں دیکھتا گیا، میرے دل میں ان کی قدر بڑھتی گئی۔ مختلف جگہوں پر ان کے پرانے ملنے والے گھنٹوں ان سے اپنے مسائل پر گفتگو کرتے اور انتہائی مطمئن اور مسرور ہوکر واپس جاتے۔

اور جب میں نے اذانِ فجر کے وقت دہلی سے آئے ہوئے ایک ٹیلی فونی پیغام پر بھائی جان کی شہادت کی خبر اچانک سنی تو "انا للہ وانا الیہ راجعون" کے بعد میرا پہلا تاثر میر تقی میرؔ کا وہ مشہور شعر تھا کہ:

مرگِ مجنوں پہ عقل گم ہے میرؔ
کیا دِوانے نے موت پائی ہے

بہرحال میں نے بھائی جان کو اپنے دینی و دنیوی فرائض کی ادائیگی میں اتنا پختہ اور اپنے حالات پر اس قدر مطمئن اور قانع دیکھا ہے کہ مجھے یقین ہے کہ جب انھیں موت آئی ہوگی تو ان کے لبوں پر تبسم رقص کناں ہوگا جو ان کے مردِ مومن ہونے کا نشان ہوگا اور کیا عجب کہ ان کا آخری تاثر یہ ہو کہ:

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

